بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

موت زندگی کا خاتمہ نہیں ہے

یٰلیتها کانت القاضیة

(اے کاش موت کے ساتھ ہی قصہ چُک گیا ہوتا)

یہ سچ ہے کہ عقل انسانی نے اس زمانہ میں نہایت ترقی کی ہے اور صدہا قسم کے علوم اس کے ذریعہ سے دنیا کو ملے ہیں اور چونکہ خود بھی وہ ایسا اپنے تئیں سمجھتی ہے اسلئے اس نشۂ تکبّر و انانیت میں سرشار ہو کر کبھی کبھی وہ یہ بھول جاتی ہے کہ میں کسی محدود ہستی کی محدود قوّت ہوں اور میں باوجود اس ترقی کے بھی اپنے تئیں کامل و اکمل نہیں کہہ سکتی پس اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی وہ خیالی تُکّے چلانے لگتی ہے۔ اور ان مقامات میں جہاں اُسے رسائی نہیں اٹکلیں دوڑانے لگتی ہے عقل نے مادّی ترقی جس قدر کی ہے وہ وہیں تک ہے جہاں تک حواس ظاہری کام کر سکتے ہیں۔ باطنی قویٰ کی طرف موجودہ زمانہ کی توجہ بہت کم ہے اور یہ قانونِ قدرت ہے کہ جن قوتوں سے زیادہ کام لیا جائے وہی بڑھتی ہیں اور جن کو معطل اور بیکار چھوڑا جائے وہ گھٹتے گھٹتے بعض دفعہ معدوم بھی ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا کسی انسان یا قوم کا محض مادّی ترقیات میں یدِ طولیٰ حاصل کر کے کوئی حق نہیں کہ وہ روحانی یا باطنی ترقی کا بھی دم مار سکے اور اُس میں اپنی اٹکل کے مطابق جو چاہے من گھڑت باتیں پیدا کرے۔ بلکہ اس کی ایک طرفہ توجہ اس بات کا ثبوت ہے کہ دوسرا پہلو کمزور ہو گیا یعنی یہ کہ روحانی قویٰ کی نشوونما سے محروم ہو گئی۔ پس ایک تو عقل کی توجہ مادّی ترقی کی طرف پھر جانے سے روحانی قویٰ میں انحطاط کا آجانا لازم ہے۔ دوسرے خواہ عقل کتنی ہی جولانیاں کرے۔ بہرحال وہ ایک محدود چیز ہے کیونکہ اُس کا ماخذ و منبع ایک محدود ہستی ہے جس طرح انسان کی تمام قوتیں محدود ہیں اور وہ ایک حد سے آگے کام نہیں کر سکتیں اسی طرح انسانی عقل بھی ایک حد کے اندر محدود ہے اور جس طرح دوسری قوتوں کے لیئے اگر ان سے اس قدرتی حد سے زیادہ بڑھکر کام لینا ہو تو خارجی مدد کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح ماننا پڑے گا کہ عقل سے اگر اسکی حد سے

زیادہ بڑھکر کام لینا چاہیں تو خارجی مدد کی ضرورت پڑیگی۔ مثلاً آنکھ کی بینائی ایک قوت ہے
چونکہ محدود ہستی کی ایک قوت ہے اس لیئے ایک حد سے آگے کام نہیں کرتی۔ کچھ فاصلے
کے آگے پھر دیکھ نہیں سکتی یا ایک خاص حد سے اگر کسی چیز کی مقدار چھوٹی ہو تو پھر اُسے دیکھ
نہیں سکتی۔ پس جب بینائی کی حد سے زیادہ فاصلہ کی دیکھنے کی ضرورت پڑتی ہے تو ہمیں خارجی
مدد کی ضرورت پڑتی ہے اور ہم دُوربین استعمال کرتے ہیں۔ دنیا نے بڑی بڑی طاقتوں
کی دُوربینیں ایجاد کی ہیں مگر چونکہ موجد محدود۔ چیز ایجاد شدہ محدود۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ مدد ایک
حد تک پہنچ کر آگے چلنے سے رہ جاتی ہے۔ اور دُوربین کی مار ایک حد پر جاکر ختم ہو جاتی ہے اسیطرح
بینائی کی حد سے زیادہ چھوٹی چیز کو دیکھنے کے لیئے ہم خارجی مدد لیتے ہیں چنانچہ اُسکے لیئے خوردبین استعمال

کرتے ہیں۔ مخلوق نے بڑی بڑی تیز خوردبینیں ایجاد کی ہیں۔ مگر ایک حد پر جاکر وہ بھی ختم۔ اسی طرح عقل
کی محدود اور ناقص حالت کی تکمیل کے لیئے دنیا نے تعلیم وتعلم کا سلسلہ شروع کیا۔ اور بڑی بڑی
یونیورسٹیاں اور لیبوریٹریاں قائم کیں۔ مگر سچ یہی ہے کہ ابھی بہت کچھ پڑا ہے۔ بقول نیوٹن کے
ابھی تو سمندر کے کنارے گھونگھے چن رہے ہیں بحر ذخار اُسی طرح پڑا ہے۔ اور یہ اُس کا حال ہے جس
میں عقل کی تگ و دو دن رات جاری ہے۔ اور جسکی تحقیقاتوں پر اُسکو بڑا ناز ہے اور ایک حد تک بجا
بھی ہے۔ مگر اُن علوم کا کیا حال جس طرف اُسکو مادی شغلوں اور انہماک سے توجہ کے لیئے فرصت ہی نہیں
اور توجہ بھی ہو تو وہاں تک سچ پوچھو تو رسائی ہی نہیں۔ بڑے سے بڑے پروفیسر کے آگے بھی ہزار زانوئے
شاگردی تہ کرو۔ اور اُسکے خیالات سے فائدہ اُٹھاؤ مگر آخر اُس کی عقل بھی تو محدود ہے۔ ایک حد تک
جاکر وہ بھی رہ جائیگی جسطرح دوربین اور خوردبین رہ گئی تھی۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ایک معاملہ میں محض عقل
ہماری کامل رہبر نہیں ہو سکتی۔ اور بالخصوص اُن مسائل میں جہاں وہ ایسی عاجز رہ جاتی ہے
کہ محض تحیر ہی تحیر اُسکے حصہ میں رہ جاتا ہے مثلاً انسان کیا ہے اُسکی ہستی کا مقصد کیا ہے۔ کدھر سے
آیا اور کدھر کو اُس کا رُخ ہے۔ جن دُکھوں اور خوف و حزن میں مبتلا رہے اور جن تغیرات کے ماتحت
اُسے کسی پہلو چین نصیب نہیں اُس سے چھٹکارا اُسے ہو سکتا ہے یا نہیں کیا فنا کے ہاتھ سے وہ
بچ سکتا ہے کیا وہ ابدی ترقی اور ابدی سُکھ کا وارث ہو سکتا ہے؟ خلاصہ یہ کہ نجات جس کے
معنے ابدی زندگی ابدی سُکھ اور ابدی ترقی کے ہیں اور جو انسانی فطرت کا صحیح تقاضا اور عین خواہش

ہے وہ اُسے نصیب بھی ہو سکتی ہے یا نہیں اور اگر ہو سکتی ہے تو کن راہوں سے ہو سکتی ہے؟ ان معاملات پر عقل کے پاس سوائے ظنیات اور تخیل کے طوفان بے تمیزی کے اور نری اٹکلیں دوڑانے کے کچھ بھی نہیں اسی لیے جتنے منہ اُتنی ہی باتیں جسے دیکھو اپنی ہی راگنی الاپ رہا ہے کوئی یقینی علم نہیں اور ہو بھی کیسے سکتا ہے کیونکہ یہ مسئلہ عقل کے حدود سے باہر نکل جاتا ہے یاد رہے کہ عقل میں اور تخیل کی جولانیوں میں فرق ہے۔ عقل کا کام ہے اپنی بنیاد صحیح اور یقینی علوم پر رکھنا۔ اسی لیئے جہاں سے ظنیات کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ وہاں عقل کے اصلی حدود ختم ہو جاتے ہیں محض ظنیات پر جس علم کی بنا ہوتی ہے اُسے ہم معقول نہیں کہہ سکتے اور نہ وہ انسان کو کچھ نفع دے سکتا ہے اور نہ کوئی عقلمند انسان اُسپر کسی اہم مسئلہ کا مدار رکھ سکتا ہے۔ پس اسجگہ آکر انسانی ہستی اور نجات کے راز سربستہ کی عقدہ کشائی کے لیئے انسانی عقل کو خارجی مدد کی ضرورت اور پیاس محسوس ہوتی ہے اور مدد بھی کسی اپنے جیسے محدود عقل والے انسان کی نہیں۔ بلکہ خود خالق فطرت کی جس نے اُس کی ہستی کو پیدا کیا اور اس تمام گورکھ دھندے کو جو نظام عالم کی شکل میں ہمارے سامنے ہے پیدا کیا۔ کیونکہ کسی مشین کے موجد کو ہی صحیح طور پر علم ہوتا ہے کہ فلاں فلاں پرزے کن کن کاموں کے لیئے ہیں اور اُنکا کیا مقصد ہے۔ باقی سب اٹکل ہے اور انسان کیلیئے ظلم ہوتا اگر وہ بے علمی کی حالت میں ہی چھوڑ دیا جاتا اور خالق فطرت اپنے علم کُل سے مدد نہ کرتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ جس طرح ایک بچہ کسی مشین کے کمرہ میں گھس کر اُسکے پرزوں کے غلط استعمال سے اپنے تئیں ہلاک کر لیتا یا کم سے کم نقصان پہنچا لیتا ہے اسی طرح وہ بھی اپنے تئیں تباہ کر لیتا۔ لہذا قدرت کے فیاض ہاتھ نے جہاں تمام کاموں میں اُسکی مدد کی تھی یہاں بھی اُسکی مدد کی اور سچ بھی یہی ہے کہ انسان بغیر قدرت کی فیاضی کے کہیں بھی اپنی کسی قوت سے کام نہیں لے سکتا۔ سورج کی روشنی نہ ہو تو آنکھ بیکار ہے۔ ہوا نہ ہو تو کان بیکار ہیں۔ اسی قانون کے مطابق عقل کی بھی قدرت نے الہام سے مدد کی۔ یعنی انسانی فطرت کے عین اس تقاضے کے مطابق خدا کی طرف سے انسان کو علم عطا ہوتا ہے اسے الہام کہتے ہیں اور چونکہ عقل کی جولانیوں کو ان مسائل میں رسائی نہیں ہوتی اسلیئے یہ علم بغیر کسی سوچ اور تردد اور تفکر اور تدبر کے جو عقل کی جولانی کی مختلف راہیں ہیں حاصل ہوتا ہے اور ایک القائے غیبی ہوتا ہے جو ایک واضح اور منکشف احساس سے کہ جیسے سامع کو متکلم سے یا مضروب کو ضارب سے یا ملموس کو لامس سے ہو محسوس ہوتا ہے۔

اور اس سے نفس کو مثل حرکات فکریہ کے کوئی الم روحانی نہیں پہنچتا۔ بلکہ جیسے عاشق اپنے معشوق کی رویت سے بلا تکلف انشراح اور انبساط پاتا ہے۔ اسی طرح نفس بھی اپنے اس فطرتی تقاضے کے پورا ہونے پر لذت اٹھاتا ہے۔ اور یہ قانونِ قدرت ہے کہ نفس اپنے فطرتی تقاضے کے ہی پورا ہونے پر کچھ لذت پاتا ہے جیسے کہ پیاس میں سرد پانی لذت دیتا ہے اور بھوک میں مرغوب کھانا خوشی پیدا کرتا ہے۔ اور یہ بھی قانونِ قدرت ہے۔ کہ انسان کے اندر جسقدر تقاضائے فطرت بھی موجود ہیں اُن سب کے پورا ہونیکا سامان نظام عالم میں موجود ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ انسانی ہستی اُنہی فطرتی تقاضاؤں کو اپنے اندر لیکر پیدا ہوتی ہے جو پہلے سے نظام عالم میں موجود ہیں۔ کیونکہ انسان اس تمام کائنات کا ایک جزو ہے اور جو کُل میں موجود ہی نہیں اُس کا تقاضا ہی فطرت میں کہاں سے پیدا ہو سکتا ہے غرض الہام کا وجود عین تقاضائے فطرت کے مطابق پڑا ہے لہٰذا اس کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا ہاں یہ ضرور ہے کہ اس فطرتی تقاضے کے پورا کرنے کی کوشش کیجائے اور وہ یہ ہے کہ ہر ایک بدی اور گند سے علیحدہ ہو کر خالقِ فطرت کے ساتھ تعلق جوڑا جائے اور اُس کی یاد میں لگا رہے اور اُسے اور صرف اُسے اپنا مقصود و معبود بنا دے۔ قرآن کریم جو خدا کی کامل کتاب ہے مذکورہ بالا مضمون کو کسقدر لطیف اور جامع اور مختصر الفاظ میں بیان فرماتا ہے وہو ہٰذا وما لھم بہ علمٍ ان یتبعون الا الظن ۚ وان الظن لا یغنی من الحق شیئاً ۚ فاعرض عن من تولّٰی ۵ عن ذکرنا ولم یرد الا الحیٰوۃ الدنیا ۵ ذٰلک مبلغھم من العلمِ ان ربک ھو اعلم بمن ضل عن سبیلہ وھو اعلم بمن اھتدٰی ۵ اس آیت کا ترجمہ مع تفسیر یُوں ہے کہ بوجہ عقل کے محدود ہونے کے علوم الٰہیات و روحانیات میں انسان کو یقینی علم تو حاصل ہو نہیں سکتا البتہ اٹکلیں ہیں اس لیئے یہ لوگ صرف ظن کی پیروی کرتے ہیں اور یہ سچ ہے کہ ظن حقیقت کے مقابلہ میں کوئی ہستی نہیں رکھتا اور کچھ بھی چیز نہیں۔ پھر اُس شخص کی بات تو ہرگز بھی قابل توجہ نہیں جس نے ہماری یاد سے (جو الہام اور انکشاف حقیقت کی کنجی تھا) منہ پھیرا اور دنیا کی زندگی کے سوا اور کچھ نہ چاہا کیونکہ دنیا کی طرف تمام توجہ ہو جانے سے قوائے روحانیہ کو کھو بیٹھا۔ اور اس طرح ان علوم میں وہ تھوڑی بہت کچھ بھی دسترس نہیں رکھتا۔ انکے علم کی رسائی تو یہاں تک ہے کہ دنیا کو جو صرف ترقی کے لیئے ایک زینہ تھا اپنا مقصود بنا بیٹھے۔ پس اے انسان تو محتاج ہے اپنے رب سے علم پانے کا یعنی

الہام کا کیونکہ بیشک تیرا رب ہی جو تیرا پیدا کرنیوالا ہے اور جس نے تجھے ابدی ترقی کی طرف لے چلنے کے لیئے پیدا کیا ہے ہاں وہی ٹھیک ٹھیک جانتا ہے کہ کون اُسکی راہ سے جو ابدی ترقی کے کے لیئے اُس نے بنائی ہے بھٹک گیا اور وہی ہاں وہی جانتا ہے کہ کون اُس راہِ راست پر پڑ لیا۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ الہام کیا ہے۔ عقل کا رہبر۔ عقل کا ہادی۔ جہاں عقل عاجز رہ جاتی ہے وہاں الہام دستگیری فرماتا ہے اور وہ عین عقل بلکہ خود عقل کو تکمیل پر پہنچانیوالا ہوتا ہے۔ یہ غلط بات ہے کہ الہام کچھ ایسی باتیں بیان کرتا ہے جو خلاف عقل ہیں۔ بلکہ وہ اُن باتوں کی عقدہ کشائی کرتا ہے جو بالاتر از عقل ہیں۔ اور بالاتر از عقل ہونے میں اور خلاف عقل ہونے میں فرق ہے۔ جو ظاہر ہے۔ خلاف عقل یہ ہے کہ کوئی کہے کہ دو اور دو پانچ ہوتے ہیں یا ایک برابر تین کے یا تین برابر ایک کے۔ یہ باتیں الہام بھی نہیں بتاتا۔ الہام تو ان باتوں کی جو عقل کی رسائی سے باہر ہیں حقیقت کے راستہ سے عقدہ کشائی فرماتا ہے اور عقل کو اُس عالی مقام کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ جہاں آپسے اسکو پہنچنا ناممکن تھا عقل کو دھکے نہیں دیتا بلکہ اُسکی دستگیری کرتا ہے۔ اسی لیئے عقل جوں جوں ترقی کریگی الہام ربانی کی ہمیشہ تائید کریگی۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ اُن تمام علوم الٰہیات و روحانیات میں جن کے ساتھ انسانی ہستی کے راز کی عقدہ کشائی وابستہ ہے اور جنپر نجات کا دارومدار ہے محض عقل رہبر نہیں ٹھہر سکتی جب تک الہام کی دستگیری ساتھ نہ ہو کیونکہ جب سے انسانی ہستی معرض وجود میں آئی۔ اور اُس میں خود شناسی و خود اختیاری کا مادہ پیدا ہوا۔ وہ اپنے افعال کا جہاں تک اُسکو وسعت اور مقدرت دیگئی ہے ذمہ وار ٹھہرا۔ پس جیسا کہ نجات کے صحیح اور یقینی علوم کا دنیا میں سب سے پہلا انسان محتاج تھا ویسا ہی بعد میں مختلف ازمنہ میں نسل انسانی کو اُس کی ضرورت رہی اور ویسی ہی ضرورت آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہیگی۔ عقل انسانی جب اسوقت تک ناقص اور ناکمل ہے تو پہلے زمانوں کا پوچھنا ہی کیا ہے اور آئندہ نقص اور تکمیل کا سلسلہ جاری ہے۔ پس بنا بریں نجات کی راہ جسے مذہب کہنا چاہیئے بغیر الہام کی مدد کے محض عقل سے انسان نہیں پا سکتا تھا اور نہ اب پا سکتا ہے اور نہ آئندہ کبھی پانے کی توقع عقلاً ہو سکتی ہے۔ پس مذہب کی بنیاد الہام پر ہوئی ہاں یہ سچ ہے کہ الہام عقل کے خلاف نہیں ہوتا۔ بلکہ عقل کے نقصوں اور کمزوریوں کو دور کرنیوالا اور

اُس کی رہنمائی کرنیوالا ہوتا ہے اور اُسکو اُن مقامات عالیہ پُہنچانیوالا ہوتا ہے جہاں وہ ازخود پہنچنے سے عاری تھی۔ پس ان معاملات میں الہام کی گواہی کو سب پر مقدم اور فائق سمجھنا ضروری اور لازمی ہے اور عقل کی گواہیاں اُسکی تائید میں ہونی چاہئیں۔ یہ مسئلہ کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں یہ بھی ہیچمچ ایک مسئلہ ہے جہاں الہام کی گواہی سب سے مقدم اور عقل کی گواہی اُس کی تائید میں اُسکی مصدق سمجھی جانی چاہیئے اتنا سمجھ لینے کے بعد اب اصل مسئلہ پر غور کرنا چاہیئے وما توفیقی الا باللہ وما شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

اس مسئلہ (یعنی موت زندگی کا خاتمہ نہیں ہے) میں جیسا کہ اوپر بیان ہوچکا ہے۔ عقل کے ہاتھ میں یقین کے طور پر تو کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ حق الیقین کے طور پر تو جبھی معلوم ہوسکتا ہے جب کوئی خود مر کر تجربہ کرے۔ البتہ قوانین نیچر کی موجودہ تحقیقات جہاں تک پہنچی ہے اُس کی بنا پر عقل ایک نتیجہ نکالتی ہے جسے ظن غالب سے بڑھکر درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ ممکن ہے کہ بعض قوانین نیچر اور بھی ایسے باریک اور مخفی ہوں کہ اُن تک ابھی تحقیقات کی رسائی نہیں ہوئی اور اس وجہ سے نتیجہ غلط نکلے۔ اور یہی وجہ ہے کہ علوم مروجہ سائنس میں بھی بعض دفعہ نتائج نکالنے میں غلطی لگ جاتی ہے بہت سے باریک در باریک اسباب ایسے ہوتے ہیں جن پر نظر تحقیق نہ پڑنے کی وجہ سے بعض دفعہ نتیجہ غلط نکل آتا ہے جنکو واقعات جھٹلا دیتے ہیں۔ پس جب یہ بالکل ممکن ہے کہ علم روحانیات کے بعض قوانین پر عقل کی ابھی تک رسائی نہ ہوئی ہو اور جیسا کہ واقعات میں ہے بھی یونہی۔ تو پھر عقل کے نتیجہ کو ظن غالب سے ہرگز ہرگز زیادہ درجہ نہیں دیا جاسکتا یا زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ قوانین نیچر کی موجودہ تحقیقات کے مطابق ایسا ہونا چاہیئے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ضرور ایسا ہی ہے۔ پس یہاں عقل کی اس کمی کو الہام ہی ہے جو پورا کرتا ہے جو بتلاتا ہے کہ واقعات میں ایسا ہی ہے۔ کیونکہ یہ بالکل سچ ہے کہ خود خالق کائنات ہی بتلائے تو بتلائے کہ موت زندگی کا خاتمہ ہے یا نہیں اور اُسی کا ارشاد یقینی ہوسکتا ہے باقی سب تکے اور ڈھکوسلے ہیں پس پہلے ہمیں عقل کے استدلال اور اخذ نتائج پر غور کرنا چاہیئے اور بعد ازاں الہام کا آخری اور یقینی فتویٰ حاصل کرنا چاہیئے وباللہ التوفیق۔

(۱) سلسلہ اسباب ونتائج

یہ امر مسلّم ہے کہ تمام کائنات مجموعہ اسباب و نتائج ہے۔ ہر ایک نتیجہ کا ایک سبب ہے اور ہر ایک سبب کا ایک نتیجہ ہے۔ اور یہ امر بھی مسلّم ہے کہ دنیا میں نیکی و بدی کا وجود بھی ہے۔

اب یہ امر ہمارے مشاہدہ میں داخل ہے کہ بدی کا نتیجہ ہم بعض وقت بُرا دیکھتے ہیں اور اسکو انصاف و عدل شمار کرتے ہیں اور جانتے ہیں .... کہ یہ بُرائی کا لازمی نتیجہ ہے۔ مگر یہ بات بھی روز کا مشاہدہ ہے کہ بہت سے اُسی قسم کی بدی میں مبتلا لوگ کوئی بُرا نتیجہ اس عالم میں نہیں پاتے اور اپنی شرارتوں ہی میں مبتلا اور ظلموں میں رنگ رلیاں مناتے دنیا کو چھوڑ جاتے ہیں۔ بدی ایک سبب ہے اور قوانین نیچر کے مطابق عقل بتلاتی ہے کہ اس کا نتیجہ لازماً بُرا ہونا چاہیئے اور ہمارا مشاہدہ اور تجربہ بھی یہی بتلاتا ہے کہ بدی کا جب کوئی نتیجہ ہمارے سامنے وقوع پذیر ہوتا ہے تو وہ بُرا ہی ہوتا ہے۔ پس یہ امر علم الیقین سے گذر کر عین الیقین اور حق الیقین تک پہنچ چکا ہے کہ بدی کا نتیجہ بُرا ہے۔ اب بعض لوگوں کو جو بدی کا نتیجہ اس عالم میں نہیں ملتا تو اس کی وجہ یہ تو نہیں ہو سکتی کہ اس کا کوئی نتیجہ ہی نہیں کیونکہ یہ مسلّم قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا ہے کہ بعض دفعہ اسباب سے نتائج نہیں نکلا کرتے اور ایسا اندھیر بھی ہؤا کرتا ہے کہ خواہ ایک ہی قسم کے سبب ہوں مگر بعض دفعہ نتیجہ نکلتا ہے اور بعض دفعہ نہیں۔ جس کا دوسرے لفظوں میں مطلب یہ بھی ہؤا کہ اشیاء اپنے خواص کے ظہور کو جو بطور نتائج ہؤا کرتے ہیں چھوڑ سکتی ہیں تو پھر تمام علوم اور سائنس کی جڑھ کٹ گئی کیونکہ ہر ایک سبب اور نتیجہ سے امان اُٹھ گیا۔ اور تمام قوانین نیچر باطل ہو گئے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض دفعہ جو بُرا نتیجہ بدی پر مترتب ہونا اس عالم میں نظر نہیں آتا اُس کی یہ وجہ نہیں ہے کہ اس کا کوئی نتیجہ ہی نہیں۔ عقل کہتی ہے۔ قوانین نیچر کہتے ہیں کہ نتیجہ نکلنا لابد ہے۔ تو پھر لازمی طور پر یہ ماننا پڑیگا کہ یہ سلسلہ اسباب و نتائج کا اسی عالم تک ختم نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی اور عالم بھی ہے جہاں ان اسباب کا نتیجہ اور بدی کی سزا ملیگی۔ اسی طرح نیکی کا حال ہے۔ نیکی کا نیک نتیجہ بعض دفعہ ہمارے سامنے ملتا ہے۔ اور اُس سے ہمیں تعجب نہیں ہوتا کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ اِسکا یہی نتیجہ قانونِ قدرت کے مطابق ہونا لابد تھا اور ہؤا۔ مگر بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک نیک انسان دُکھوں میں مبتلا دنیا سے گذر جاتا ہے اسکی نیکیوں کا کوئی نتیجہ اس زندگی میں نہیں نکلتا۔ اگر سلسلہ اسباب و نتائج اور قوانین قدرت صحیح ہیں تو پھر یہ بھی

صحیح ہے کہ زندگی کا موت کے ساتھ ہی خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ بلکہ صرف شکل بدل جاتی ہے اور ایک نئی قسم کی زندگی اور عالم شروع ہو جاتا ہے جو اس موجودہ زندگی کے لیئے بطور نتیجہ کے ہے عقل کے مذکورہ بالا نتیجہ پر ہمیں حق الیقین تک پہنچنے کے لیئے الہام کی شہادت کی ضرورت ہے عقل نے تو فتویٰ دیدیا کہ نیکی اور بدی کی جزا و سزا ملنے کے لیئے زندگی کا یہیں تک خاتمہ نہیں ہونا چاہیئے بلکہ لازم طور پر ایک اور عالم ہونا چاہیئے۔ مگر اس امر کے لیئے کہ واقعات لا محالہ ضرور ضرور یونہی ہیں الہام کی رہبری کی ہمیں ضرورت ہے۔ الہام سے مستفید ہونے کے لیئے ہمیں کوئی ذریعہ ہونا چاہیئے اور وہ الہامی کتابیں ہیں۔ مگر دنیا میں جسقدر الہامی کتابیں ہیں وہ بدقسمتی سے سب کی سب سوائے قرآن مجید کے انسانی دستبرد سے تاریخی طور پر محفوظ نہیں رہیں۔ بعض کی نسبت تو یہ پتہ بھی نہیں لگتا کہ وہ دراصل کس زبان میں تھیں یا اگر زبان کا پتہ بھی لگا تو وہ زبانیں مردہ ہو کر اب انکا سمجھنا محال ہو گیا اور ہر طرح کی تاویلوں اور کاٹ چھانٹ کی گنجایش نکل آئی مثلاً وید یا ژند اوستا وغیرہ۔ اور بعض تو صرف تراجم ہی رہ گئے اور اصل کتاب مفقود ہو گئی مثلاً بائیبل وغیرہ اور ظاہر ہے کہ ترجمہ مترجم کے خیالات کا آئینہ ہوتا ہے۔ پھر ان تمام کتابوں کی نسبت کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں کہ یہ محفوظ ہیں۔ بلکہ بعض کی نسبت تو محققین نے صاف طور پر کہدیا کہ یہ انسانی بناوٹ ہے۔ مثلاً اناجیل وغیرہ پس الہامی کتابوں میں قرآن ہی ایک ایسی کتاب ہے جو الہامی ہونے کے ساتھ کل کی کل محفوظ ہے اور تاریخی طور سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہنچ چکی ہے اور اس زمانہ کے ایک ملہم حضرت میرزا غلام احمد نامی نے بھی جنکے ملہم ہونے کا ثبوت بہت سے نشانات اور تائیدات آسمانی سے ثابت ہو چکا ہے یہی گواہی دی کہ قرآن ہی ایک کتاب ہے جو محفوظ اور خدا کی کامل اور جامع کتاب ہے۔ پھر اس کتاب قرآن مجید میں یہ کمال ہے۔ کہ یہ دوسری الہامی کتب کی طرح صرف دعویٰ ہی دعویٰ نہیں پیش کرتی بلکہ دلائل بھی ساتھ دیتی ہے۔ اور اسلیئے عقل اور الہام کے باہمی تطبیق کے لیئے اس سے بہتر اور کوئی کتاب نہیں ہو سکتی۔ پس ہم ہر ایک عقل کے فتوے پر الہامی شہادت کے لیئے قرآن مجید کو لیں گے اور اُس سے فیصلہ کرینگے۔ چنانچہ موجودہ مسئلہ پر قرآن مجید کا فیصلہ مختلف آیات پر یکجائی طور پر نظر ڈالنے سے حسب ذیل ہے:۔

وخلق اللہ السموات والارض بالحق ولتجزیٰ کل نفس بما کسبت وھم

لا یظلمون ۰ واللہ لا یضیع اجر العاملین ۰ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ۰ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ ۰ وما خلقنا السموات والارض وما بینھما لعبین ۰ ماخلقنھما الا بالحق ولکن اکثرھم لا یعلمون ۰ قل امر ربی بالقسط ۰ ملک یوم الدین ۰ ترجمہ مع تفسیر- اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حق وحکمت اور مقاصد کے ساتھ پیدا کیا اور ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہر ایک نفس یعنی ہر ایک شخص جو وہ کماتا اور عمل کرتا ہے اُسکا اُسے بدلہ دیا جائے اور اُنپر کسی طرح بھی ظلم نہ ہو- اور اللہ عمل کرنیوالوں کا اجر ضائع نہیں کرتا- اور جو کوئی ذرہ کے برابر نیک عمل کرتا ہے اُسے بھی دیکھ لیگا اور جو ذرہ برابر بُرا عمل کرتا ہے اُسے بھی دیکھ لیگا- یہ اس لیئے ہے کہ ہم نے آسمان اور زمین اور جو اُنکے درمیان ہے بطور کھیل کے بے حقیقت نہیں پیدا کیا بلکہ ہم نے تو اُنکو حقیقت کے ساتھ پیدا کیا- اور قوانین واسباب ونتائج سے وابستہ کیا- اگر قوانین اور سلسلہ اسباب ونتائج سے انکار کر دیا جائے تو پھر تمام چیزیں بے حقیقت اور لغو ہو جاتی ہیں لیکن چونکہ کثرت سے لوگ ان امور کو نہیں سمجھتے اسلیئے جلدی سے انکار کر دیتے ہیں یہ بھی بتلا دو کہ میرے رب کے تمام کام عدل اور انصاف پر مبنی ہیں- پس اگر نیکی کا نیک اور بدی کا بد بدلہ نہ ملے تو عدل اور انصاف کا خاتمہ ہو جاتا ہے- ایک ظالم کو اُسکے ظلم کی پاداش کا نہ ملنا اور ایک مظلوم کو اُسکے صبر کی جزا نہ ملنا یہ خدا کا انصاف کب گوارا کر سکتا ہے- پس خدا کے انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ نیکی و بدی کا بدلہ ضرور ملے- ہاں اس صفت کے کامل ظہور کیلیئے یہ عالم کافی نہیں اس لیئے ایک دوسرا عالم ہے جس میں اُسکی صفت ملک یوم الدین کا پورا پورا ظہور ہوگا- اور ہر ایک کو اپنے عمل کا بدلہ ملیگا اور وہ عالم اس عالم کیلیئے بطور نتیجہ کے ہوگا کیونکہ جب ہر ایک سبب کا نتیجہ ہے تو یہ عالم جو مجموعہ اسباب ہے بحیثیت ایک سبب کے ضرور ہے کہ کوئی دوسرا عالم بطور نتیجہ کے رکھے-

(۲) مسئلہ ارتقا-

یہ مانا جاتا ہے کہ انسان مادہ کی ترقی کا ایک مقام اور ایک شکل ہے- گویا زندگی کیا ہے- مادہ کی ترقی کرنے سے ایک خاص حالت اور کیفیت پیدا ہو جاتی ہے- یہ ظاہر ہے کہ مادہ کی ترقی کا مقصد اور سبب بقا کی کوشش ہے- بقا کیلیئے ضروری بلکہ لازم ملزوم کی طرح ہے کہ مادہ سکون کیحالت میں نہ ہو بلکہ حرکت میں ہو اور یہ حرکت کی لہر ترقی کی طرف ہو- اسی لیئے ابتدائے عالم میں

بھی جب کچھ نہ تھا اور صرف ذرات ہی موجود تھے یہ مانا جاتا ہے کہ وہ ذرات حرکت میں رہتے تھے کیونکہ بقا کے لیئے اس حرکت کی ضرورت تھی۔ یہ مادہ کی ترقی کا پہلا زینہ اور زندگی کی صفت کا ایک پرتو تھا چونکہ یہ حرکت بقا کے لیئے تھی اسلیئے لازماً ترقی کی طرف مادہ کی رو چلی۔ ترقی کے مختلف مراتب طے کرکے سب سے پہلے نباتات پیدا ہوئی جو بیّن طور پر زندگی کے ظہور کا پہلا درجہ تھا۔ زندگی کی تعریف یورپ کے مشہور فلاسفر ہربرٹ اسپنسر نے یوں کی ہے کہ یہ ایک طاقت ہے جس چیز میں کہ وہ موجود ہو اسکی حالت کو وہ گرداگرد کی چیزوں آب و ہوا اور تمام کائنات سے مطابق رکھنے کی کوشش کرتی ہے اور کوئی حصہ اس چیز کا جس میں کہ یہ ہے نقصان ہو جائے تو اس کی تلافی کرنے کی کوشش کرتی ہے مثلاً جسم کی حرارت کو موسم کی سردی یا گرمی کے مطابق رکھتی ہے یا اگر کوئی زخم جسم پر پیدا ہو جائے تو اسکی اندمال کی کوشش کرتی ہے۔ اب اس تعریف سے جو کہ زندگی کی گئی اور جیسا کہ فی الواقعہ مشاہدہ میں بھی پایا جاتا ہے یہی نکلتا ہے کہ در اصل زندگی کا مقصد اس چیز کی بقا کی کوشش ہے جسمیں کہ وہ پائی جاتی ہے جسم کی حرارت کو باہر کی آب و ہوا سے مطابق کرتے رہنا اور جسم کے نقصانوں مثلاً زخم وغیرہ کی تلافی کرتے رہنا اور انہیں اندمال کی طرف لانا صاف ظاہر کرتا ہے کہ زندگی کا مقصد یہی ہے کہ جس چیز میں کہ پائی جائے اُسکی بقا کی کوشش کرے۔ چونکہ زندگی مادہ سے پیدا ہوئی ہے یا یوں کہو کہ مادہ کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے۔ اسلیئے معلوم ہوا کہ زندگی اُسی خاصیت مادہ کا ظہور ہے جو بقا کے حصول کے لیئے مادہ کی شکلیں بدلتی — اور ترقی کی طرف لے چلتی ہے۔ پھر جس جس طرح مادہ ترقی کرتا ہے اور زندگی ترقی یافتہ شکلیں اختیار کرتی جاتی ہے اُس اسطرح بقا کے حصول کی کوشش بڑھتی اور مقابلۃً کامیاب ہوتی نظر آتی ہے۔ نباتاتی زندگی ادنیٰ شکل زندگی کی تھی۔ اور اس میں ابھی اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ مرکز خاکی کے ساتھ گہرا تعلق رکھنے کے بغیر زندہ بھی رہ سکے اسلیئے مادہ نے اس سے آگے ترقی کی اور حیوانات کی شکل اختیار کی پہلے ادنیٰ حیوانات کی جو پانی میں اور مٹی میں رہتے تھے وہ گو حرکت کرتے تھے مگر مرکز خاکی سے ابھی گہرا تعلق چلا جاتا تھا۔ اسکے بعد اعلیٰ حیوانات پیدا ہوئے جو زمین پر چلتے پھرتے اڑتے ہیں انکا تعلق گو مرکز خاکی سے رہا مگر نسبتاً کم ہو گیا۔ اور یہ زندگی پہلی زندگیوں سے اعلیٰ تھی مگر ابھی ناقص تھی کیونکہ اس میں خود شناسی اور خود اختیاری نہ پیدا ہوئی تھی اور ابھی تک حیوانات کے افعال محض انسٹنکٹ (عقل حیوانی)

کے نیچے تھے۔ جب مادہ نے اس سے آگے ترقی کی تو انسان بنا یعنی زندگی نے یہاں تک ترقی کی کہ نہ صرف جسم کی حالت کو گردونواح کی حالت سے مطابق رکھ سکے اور اُس کے نقصانات کی تلافی کرتی رہے بلکہ اس میں خودشناسی اور خوداختیاری پیدا ہو کر اس قابل ہو گئی کہ وہ اپنی ہستی کو پہچانے اور علاوہ فطرتی افعال کے جو اسکے بقا کے لیئے دن رات لگے رہتے ہیں خود اپنے اختیار سے بھی اپنے بقا کے حصول کی کوشش کرے۔ طب۔ جراحی۔ حفظان صحت اور روحانیات کی تمام ترقیاں صرف حصول بقا کی کوشش کا کرشمہ ہیں۔ اس حالت زندگی کا نام نفس انسانی ہے۔ لیکن کیا یہاں آکر سلسلہ ترقیات کا بند ہو گیا۔ اگر ایسا ہے تو حصول بقا کے لیئے مادہ کی ترقی کی رفتار تمام اکارت گئی۔ اور مسئلہ ارتقا کا باطل ہو گیا۔ پس بات حقیقت میں یوں ہے۔ کہ مادہ کی ترقی کی لہر ایک لامحدود ترقی کی طرف ہے۔ اور حصول بقا کی یہی ایک راہ ہے۔ مگر مادہ کی جسمانی شکل چونکہ مکان اور زمان کی قید میں مقید ہے اسلیئے لامحدود ترقی کی طرف نہیں چل سکتی یہی وجہ ہے کہ مادہ اپنی ترقی کی رَو میں غیر مادی اطوار اختیار کرتا جاتا ہے۔ جسے زندگی یا جان کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ غیر مادی لطیف حالت میں مکان اور زمان کی قید باقی نہیں رہتی۔ اور ترقی لامحدود کا رستہ کھُل جاتا ہے۔ جو بقا کے حصول کے لیئے ضروری ہے۔ پس زندگی کی حالت میں جہاں مادہ کے حصول بقا کی خاصیت کا ظہور ہوتا ہے اور جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مادہ کی ترقی حصول بقا کے لیئے ہے۔ وہاں ساتھ ہی مادہ بھی وہ شکل اختیار کرتا چلا جاتا ہے جو لامحدود ترقی کے لیئے ضروری ہے۔ نباتاتی زندگی میں زندگی کا جزو بہت نمایاں نہیں ہوتا۔ حیوانوں میں البتہ زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ مگر صرف انسان میں آکر جو مادہ کی کثیف حالت کی ترقی کی انتہا ہے وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اپنی ہستی کو کثیف مادہ یعنی جسم سے علیحدہ پہچاننے لگتا اور اس سے جُدا ہونیکے بعد بھی قائم رکھ سکتا ہے۔ پس مسئلہ ارتقا اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ ہم سے منوائے کہ مادہ کی ترقی لامتناہی کی رفتار میں انسان ایک ایسا مقام ہے جہاں پر اگر ایک طرف مادہ کا کثیف حصہ بوجہ اپنی محدود حالت کے آگے ترقی نہیں کرسکتا تو دوسری طرف مادہ کا غیر مادی لطیف حصہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ جسمانی کثیف مادہ سے اپنی ہستی علیحدہ قائم کرسکے اور اپنے لیئے لامتناہی ترقی کے لیئے قید زمان و مکان سے آزاد ہو کر راہ نکال لے۔ چنانچہ موت جسے کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ یہی کہ مادہ کا

لطیف غیر مادی حصہ جو اب ایک علیحدہ ہستی بن چکا ہے مادہ کثیف جسم کی قید سے آزاد ہو کر لامتناہی ترقی کی رفتار میں آزادی سے چلتا ہے اور یہی مادہ کی ترقی کا منشا اور تقاضہ تھا گویا موت ایوولیوشن (ارتقا) کی رفتار میں ترقی کا ایک زینہ ہے۔

اب قرآن کریم کی مختلف آیات کو یکجائی طور پر نظر کرتے ہیں:۔

لقد خلقنا الانسان من صلصال من حما مسنون ه والله انبتکم من الارض نباتا ه الذی احسن کل شیئًا خلقه و بدأ خلق الانسان من طین ثم جعل نسله من سلالة من ماء مهین ه ثم جعلنٰه نطفةً فی قرار مکین ه ثم خلقنا النطفة علقةً فخلقنا العلقة مضغةً فخلقنا المضغة عظامًا فکسونا العظام لحمًا ق ثم انشانٰه خلقًا اٰخر فتبارك الله احسن الخالقین ه الله یتوفی الانفس حین موتها الحمد لله رب العٰلمین الرحمٰن الرحیم ه تفسیری ترجمہ۔ بے شک ہم نے انسان کو سڑے ہوئے کیچڑ یعنی گیلی مٹی کے خلاصہ در خلاصہ سے پیدا کیا۔ ظاہر ہے کہ انسان خلاصہ در خلاصہ ہے نطفہ سے اور نطفہ خون سے اور خون غذا سے اور غذا خواہ حیوانی ہو یا نباتاتی ابتداءً نباتات سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اور نباتات جب تک زمین پر ہل جوت کر اس میں پانی اور کھاد ڈالکر اسے سڑا ہوا کیچڑ نہ بنائیں نہیں پیدا ہوتی چنانچہ آگے فرماتے ہیں اور اللہ نے اگایا تمہیں زمین میں اگانا یعنی زمین سے اور تمہیں نشو و نما اور بتدریج ترقی دیتے دیتے موجودہ حالت کو پہنچایا۔ پھر فرمایا۔ کہ خدا وہ ہے جس نے ہر چیز کو نہایت عمدہ خلقت عطا فرمائی ہے اور انسان کی پیدائش کو مٹی سے شروع کیا۔ پھر اسکی نسل کو حقیر رطوبت یعنی نطفہ کے خلاصہ سے چلایا۔ پھر نطفہ کی حالت میں بناکر باوجود حقیر چیز ہونے کے جو کہ اسپرمیٹوزا اور اووم کے ملنے سے پیدا ہوا ہے۔ اُسے حفاظت کی جگہ یعنی رحم میں رکھا۔ پھر ہم نے نطفہ کو رحم سے تعلق پکڑنے والا اور لٹکنے والا بنایا۔ پھر اُسے گوشت کی ایک بوٹی بنایا۔ اور بوٹی سے ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں کو گوشت سے جو پہلے موجود ہے ڈھانپ دیا۔ علاوہ اسکے ہم نے انسان کو مذکورہ بالا پیدائش سوا ایک اور ہی قسم کی خلقت میں ترقی دینی شروع کی یعنی نفس انسانی کو پیدا کر کے پرورش کرنا اور ترقی

دینا شروع کیا۔ پس بہت برکت والا ہے اللہ جو نہایت ہی عمدہ پیدا کرنے والا ہے۔ اس لئے جب
وہ کسی کو پیدا کرکے پرورش کرے اور ترقی دے تو جیسی اس کی برکتیں لا انتہا ہیں ویسے ہی ترقی
کی بھی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ اللہ ان نفسوں کو جو انسانی نفوس ہیں موت کے وقت قبض کر لیتا ہے
یعنی موت دراصل نفوس انسانی کا ملاء اعلیٰ کی طرف جانے کے لئے ایک دروازہ ہے۔ تمام
تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام عالموں کا رب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو نیست سے ہست
کرکے جمادات و نباتات و حیوانات کے تمام عالموں سے بتدریج ترقی دیتا ہوا موجودہ حالت
میں لایا ہے کیونکہ اس کی ربوبیت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ ادنیٰ سے اعلیٰ حالت کی طرف ترقی
دے اور ہمیشہ کمال کی طرف لیجائے۔ اور جیسے خدا کی صفت ربوبیت کا کوئی انتہا نہیں۔
اسی طرح ترقی اور تکمیل کی بھی کوئی انتہا نہیں۔ پس ضرور ہے کہ انسان موجودہ حالت سے آگے
ترقی کرے۔ اسکے لئے رحمٰن صفت نے انسان کی موجودہ حالت خودشناسی و خود
اختیاری سے قبل ترقی کے تمام اسباب مہیا کئے اور موجودہ حالت میں بھی محض اپنے
فضل سے تمام سامان ظاہری اور باطنی ترقی کے مہیا کئے اور جب اس نے ان سامانوں
سے فائدہ اٹھایا تو رحیم صفت نے اس کی کوشش کو بارور کیا اور نیز ترقی کے اور سامان
عطا کئے اور اسطرح اسکو ابدی ترقی کا موقع دیا۔

(۳) قدرت کے موجودہ قوانین کے ماتحت کسی چیز کا فنا ہونا اسکی حالت موجودہ
کا بدل جانا ہے۔ اور یہ سائنس کا مسئلہ ہے کسی کو اس سے انکار نہیں۔
مثلاً لکڑی کو جلایا جائے تو وہ فنا نہیں ہو گئی بلکہ شکل بدل گئی۔ کچھ راکھ بن گئی کچھ
کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس بنکر ہوا میں مل گئی۔ پس یہی قانون انسان کے بارے میں
بھی لگنا چاہئے کہ جسے موت کہتے ہیں وہ دراصل ایک حالت بدل جانے کا نام ہے۔
جہاں جسم کے ذرات اگرچہ خاک میں مل جاتے ہیں مگر انکی ہستی مٹ نہیں جاتی۔ اور عالم
کثیف کے ساتھ مل جاتے اور موجود رہتے ہیں اسی طرح نفس انسانی جو ایک لطیف چیز ہے
وہ بھی باقی رہتا ہے مٹ نہیں جاتا۔ اور عالم لطیف میں داخل ہو جاتا اور سلسلہ ارتقا یعنی
ربوبیت الٰہی کے ماتحت ابدی ترقی کرتا ہے۔ کثیف چیزیں تو صاف نظر آتی

رہتی ہیں۔ مگر چونکہ لطیف چیزیں نظر نہیں آتی ہیں۔ اسلیئے مشاہدۂ قدرت میں سے میں ایک لطیف چیز کی مثال لیتا ہوں۔ مثلاً سورج کی روشنی۔ ایک لطیف چیز ہے۔ نفس انسانی کی طرح اس کا مبدا بھی مادہ ہے۔ جب سبز درخت اسکو جذب کر لیتے ہیں تو بظاہر اس کا کہیں نام و نشان نہیں نظر آتا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکی ہستی مٹ گئی۔ مگر جب وہ لکڑی خشک ہو کر یا کوئلہ کی شکل میں آ کر جلائی جاتی ہے تو وہی روشنی جو جذب ہوئی تھی اب دوبارہ ظہور پکڑتی ہے۔ اور آگ کی روشنی نام رکھاتی ہے۔ اسی لیئے سائنس دان کوئلہ کو باٹلڈ سن شائن (بوتل میں بند کی ہوئی سورج کی روشنی) کہتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ لطیف چیزیں بھی ہرگز ہرگز نیست نہیں ہو جاتی ہیں۔ بلکہ کسی اور حالت میں موجود ہوتی ہیں گو ہمیں نظر نہ آئیں۔

قرآن کریم بھی فرماتا ہے۔ اولم یر الانسان انا خلقنٰه من نطفة فاذا هو خصيم مبين ٥ وضرب لنا مثلاً ونسى خلقه قال من يحي العظام وهى رميم ٥ قل يحييها الذى انشاها اول مرة وهو بكل خلق عليم ٥ الذى جعل لكم من الشجر الاخضر نارًا فاذا انتم منه توقدون ٥

تفسیری ترجمہ۔ کیا انسان نے نظر نہیں کی کہ ہم نے اُسکو ایک حقیر چیز سے پیدا کیا اور ترقی دیکر موجودہ کمال پر پہنچایا۔ بایں ہمہ وہ جھگڑتا اور ہم سے قطع تعلق کرتا ہے۔ اور ہماری نسبت باتیں بناتا ہے اور اپنی پیدائش کو بھول گیا۔ کہ خدا تو ادنیٰ سے اعلیٰ حالت کی طرف ترقی دیتا ہے۔ پس اس امر پر غور نہ کیا اور جسم کی ظاہری حالت پر نظر کر کے کہنے لگا کہ ان ہڈیوں کو جب یہ سڑ گل کر ریزہ ریزہ ہو گئیں کون زندہ کر سکتا ہے؟ کہدے وہی انہیں زندہ کر سکتا ہے جس نے پہلے پیدا کی تھیں اگر پہلے اسباب ایسے پیدا ہو گئے جن سے مٹی سے ترقی کر کے زندہ ہڈیاں پیدا ہو گئیں تو پھر وہی قدرت کیا دوبارہ نہیں زندہ کر سکتی اور وہ خدا تو ہر قسم کی پیدائش کا علم رکھتا ہے۔ اُسکے علم اور قدرت کی کوئی حد بستگی نہیں۔ مگر وہ خدا تمہاری جانوں اور نفوس کو کب فنا ہونے دیتا ہے جب کہ وہ سورج کی روشنی کو سبز درختوں میں محفوظ رکھتا اور پھر اُسے تمہارے فائدہ کے لیئے آگ کی شکل میں نکالتا ہے جس سے تم آگ روشن کرتے ہو۔ پس جب روشنی سبز درختوں میں محفوظ رہتی اور نیست

نہیں ہوجاتی ہے تو تمھارے نفوس کیوں نیست ہو جائیں۔ خدا کا قانون تو ایک ہی ہے۔

(۴) قلب یعنی نفس انسانی گواہی۔

نفس انسانی خود شناسی و خود اختیاری کی حالت پا لینے کے بعد اپنے قلب کے اندر یہ فطرتی آواز محسوس کرتا ہے۔ کہ وہ جسم سے ایک علیحدہ ہستی ہے۔ یہ کہ وہ فنا نہیں ہوگا اور یہ کہ اس نے اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتنا ہے۔ یہ فطرت کی آواز اور قلب کی گواہی کیا ہے؟ وہی انسٹنکٹ (فہم حیوانی) ہے جو حیوانوں میں پایا جاتا ہے اور جس کے ماتحت وہ چلکر اپنے کُل کام اپنے طبائع کے مطابق کرتے اور کبھی غلطی نہیں کرتے ہیں۔ یعنی حیوانات اگرچہ خود شناسی اور خود اختیاری کامل طور پر نہیں رکھتے مگر فطرت کے ماتحت وہ اپنے تمام کام نہایت صحت کے ساتھ کرتے ہیں۔ مثلاً دیکھا گیا ہے کہ کُتا بعض بیماریوں میں ایک خاص قسم کی گھاس کھا لیتا ہے جس سے اُسے قے ہوجاتی ہے۔ اس نے اس گھاس کے یہ خواص کسی مدرسہ میں نہیں پڑھے۔ یا بیا ایک گھونسلا بناتی ہے یا شہد کی مکھی شش پہلو خانے بناتی ہے جو اصول مساحت کے رُو سے اپنے اندر سب سے زیادہ چھوٹی جگہ میں سب سے زیادہ ذخیرہ جمع کر سکتے ہیں یہ اصول تعمیر کے ان جانوروں نے کسی انجنیرنگ کالج میں نہیں پڑھے صرف انسٹنکٹ یعنی فطرت ہے۔ کسی بکری نے اگر شیر تمام عمر بھی نہ دیکھا ہو اُسے اگر شیر کے سامنے لاؤ گے تو وہ بے اختیار فوراً اپنی جان بچانے کے لیئے بھاگنے کی کوشش کریگی یہ سب کچھ انسٹنکٹ کا کرشمہ ہے۔ بغیر غور و فکر مشاہدہ یا تجربہ کے محض فطرت کی رہبری کے ماتحت یہ افعال سرزد ہوتے ہیں۔ اور سب درست ہوتے ہیں۔ انسان تو چونکہ ترقی یافتہ ہے اور خود شناسی و خود اختیاری کا مادہ اپنے اندر رکھتا ہے اسلیئے اسکے اندر ایک اور قوت ہے جسے ذہن (عقل) کہتے ہیں اور یہ اسکے ماتحت چلتا اور غور و فکر کرتا اور اپنے افعال میں ذمہ وار ٹھہرتا ہے۔ مگر اسکے اندر وہ قوت بھی موجود ہے جو بحیثیت حیوان ہونے کے دوسرے حیوانوں کے ساتھ مشترک ہے۔ یعنی قلب اور فطرت کی آواز جسے انسٹنکٹ کی ایک ترقی یافتہ شکل کہیں گے۔ پس قلب کا ایک بات کو مسلّم طور پر بلا تامّل صحیح جاننا اور ماننا یہ فطرت کی آواز اور ترقی یافتہ انسٹنکٹ ہے اور جو ہمیشہ بعد میں تجربہ سے صحیح ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ

تمام علوم کے اصول متعارفہ اسی بات پر مبنی ہیں۔ مثلاً فطرت پہلے سے مانتی ہے کہ ایک چیز ایک ہی وقت میں دو جگہ نہیں ہو سکتی۔ یا ایک چیز ایک جگہ سے دوسری جگہ نصف فاصلہ طے کرکے نہیں پہنچ سکتی۔ یا متوازی خطوط آپس میں نہیں مل سکتے۔ یا جو دو چیزیں الگ الگ ایک ہی چیز کے برابر ہوں تو آپس میں بھی برابر ہونگی وغیرہ وغیرہ۔ ان باتوں کو بعد میں تجربہ بھی صحیح ثابت کرتا ہے۔ اسی طرح قلب بے اختیار ہمیشہ خوشی کو پسند کرتا اور غم کو ناپسند کرتا ہے۔ مگر یہ تو بعد میں تجربہ نے ثابت کیا کہ خوشی زندگی کو بڑھاتی ہے اور غم زندگی کو کم کرتا اور تباہ کرتا ہے۔ پس اسی طرح قلب کے اندر یہ ایک فطرتی آواز ہے کہ وہ جسم سے ایک علیحدہ ہستی ہے اور یہ کہ وہ ہمیشہ رہے گا اور یہ کہ اُس نے اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتنا ہے۔ جس کو بعد میں تجربہ لازماً صحیح ثابت کریگا۔ اور جوں جوں نفس انسانی ترقی کرتا ہے یہ آواز تیز اور صاف ہوتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ پروفیسر گیٹ نے بھی اپنے مضمون **حیات بعد الموت** میں مندرجہ بالا بیان کی تصدیق فرمائی ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں اور تفصیل کر دینا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا ارشاد لکھ دوں وھو ھذا۔ لا اقسم بیوم القیٰمۃ ۝ ولا اقسم بالنفس اللوامۃ ۝ ..... بل الانسان علیٰ نفسہ بصیرۃ ۝ ولو القیٰ معاذیرہٗ ۝

تفسیری ترجمہ۔ میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی جو جزا سزا کا دن ہے یعنی بطور گواہ کے جزا سزا کے دن کو پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ بقائے روح کے لیئے گواہ جزا سزا ہے۔ کہ نیکی کا نیک اور بدی کا بد نتیجہ ملنے کے لیئے ضرور ہے کہ کوئی عالم اور وقت ہو۔ (جیسا کہ عقل دلیل کے ضمن میں تفصیل سے ذکر ہو چکا) اور میں قسم کھاتا ہوں ملامت کرنیوالے نفس کی یعنی بطور گواہ کے پیش کرتا ہوں اُس نفس کو جو انسان کو جب وہ کوئی بُرا کام کرتا ہے تو اندر ہی اندر ملامت کرتا ہے۔ اور وہ شخص بُرا کام کرکے حقیقی خوشی اور سچی راحت کبھی محسوس نہیں کرتا۔ اگر بُرے کام کا بدلہ بُرا نہیں اور بدی کا نتیجہ خوفناک نہیں تو پھر نفس میں یہ ملامت کیوں موجود ہے۔ یہ ملامت ہی اس بات پر گواہ ہے کہ نفس اپنے اندر بصیرت رکھتا ہے (جسے انسٹنکٹ کہتے ہیں) اور جو بدی کے نتیجہ میں آنیوالے خطرہ کے مقام کو معلوم کرتا ہے اور ہم کو اُس سے روکنا چاہتا ہے تاکہ ہماری بقا کی راہ میں روک اور حرج نہ واقع ہو۔ (یہ روکنا ٹھیک ویسے ہی ہے جیسے ایک بکری جس نے عمر بھر بھیڑیا نہیں دیکھا اگر ایک بھیڑیئے کے سامنے کیجاوے۔ تو وہ اُس سے ڈرے گی اور اُس سے بچنے کے لیئے

ہر طرح کی کوشش کو کام میں لاویگی اس کی وجہ یہی نفس کی بصیرت یعنی اِنسٹنکٹ ہے جو معلوم کرلیتی ہے کہ بھیڑیا مجھے ہلاک کردیگا۔ چونکہ بھیڑیا اُس کا دشمن ہے اس لیئے اُسکی فطرت میں رکھا گیا ہے کہ وہ اس سے خائف رہے۔ اسی طرح چونکہ ایک دن بُرے کاموں کی سزا ملنی لابدہے اور بدی انسان کی دشمن ہے اسی لیئے انسان کا نفس اپنی بصیرت سے بطور تقاضائے فطرت کے اُس سے ڈرتا اور انسان کو ملامت کرتا ہے تاکہ انسان بُرے نتیجہ سے بچ جائے) پس قرآن فرماتا ہے کہ بات یونہی ہے کہ انسان اپنے نفس پر بصیرت رکھتا ہے خواہ وہ عذر اور بہانے پیش کرتا رہے۔ یعنی انسان اپنے نفس کو دیکھتا ہے۔ اور سمجھتا ہے اور اُسکی آواز کو محسوس کرتا ہے خواہ وہ بہانہ بازیوں سے ٹال مٹول کیوں نہ کرے۔ ڈاکوؤں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ دوسرے کا مال تو ناحق چھینتے ہیں مگر آپسمیں مال کی تقسیم کے وقت بڑی دیانتداری کو کام میں لاتے ہیں۔ کوئی ڈاکو اگر چوری کے مال میں خیانت کرے تو وہ نکالدیا جاتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انکا نفس مال کے ناحق کھانے کو بُرا سمجھتا ہے خواہ وہ اپنے ڈاکہ مارنے کے لیئے کچھ ہی بہانہ کیوں نہ پیش کریں۔

اسکے بعد میں نفس کی گواہی کو جو مختلف شکلوں میں ہمارے پیش نظر ہوتی ہے بیان کرتا ہوں:۔

(۲) نفس انسانی اس بات کو بالکل فطرتی طور پر بلا تامل سمجھتا اور محسوس کرتا ہے کہ مَیں جسم سے ایک علیحدہ ہستی ہوں۔ خواہ کوئی کتنا ہی اس بات کا منکر ہو یہی کہتا ہے۔ اور فطرتی طور پر کہتا ہے۔ میرا ہاتھ۔ میرا پاؤں۔ میرا سر۔ میرا دماغ۔ میرا دل۔ میرا جسم۔ اگر ہاتھ کٹ جائیگا تو کہے گا میرا ہاتھ کٹ گیا۔ مگر اس کے ساتھ نفس میں یہ کبھی خیال نہیں پیدا ہوگا کہ مَیں کچھ کم ہوگیا۔ ہاتھ کے کٹنے سے پہلے نفس انسانی اپنی ہستی کو جیسی کامل سمجھتا تھا۔ ویسی ہی ہاتھ کے کٹ جانے کے بعد بھی سمجھتا ہے۔ ٹانگ کٹ جائے۔ تلی نکال دیجائے۔ بلکہ بعض دفعہ اعضائے رئیسہ میں سے بھی کچھ نکال دیا جاتا ہے مگر باوجود ان تمام کمی ہوجانے کے نفس انسانی اپنی ہستی میں کمی نہیں پاتا بلکہ ویسا ہی کامل سمجھتا ہے جیسا کہ اس سے پہلے تھا۔ اگر نفس انسانی علیحدہ ہستی نہیں تو پھر لازماً کسی عضو کے کم ہوجانے سے نفس اپنی ہستی میں کمی پاتا۔ مگر ایسا نہیں ہوتا۔ پس ان مذکورہ بالا باتوں سے جہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ نفس انسانی ایک علیحدہ

ہستی ہے وہاں یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جسم کے کٹ جانے اور اُسکی علیحدگی سے نفس انسانی میں کمی یا خلل واقع نہیں ہوتا بلکہ وہ ویسے ہی کامل اور باقی رہتا ہے۔

(ب) قاعدہ ہے کہ کسی چیز کی ہستی اُسکی صفات سے پہچانی جاتی ہے۔ نیز یہ بھی مسلّم ہے کہ انسان گو ایک ترقی یافتہ حیوان ہے۔ مگر اسکے حیوان ہونے میں کوئی شک نہیں۔ اب اگر انسان کی ہستی پر غور کیا جائے تو اس میں دو زندگیوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک تو وہ جو تمام حیوانات کے ساتھ مشترک ہے۔ اور جس میں طبائع کے ماتحت کام ہوتا ہے اس میں انسان کسی امر کا ذمہ وار نہیں۔ مثلاً سانس لینا۔ بھوک کا لگنا۔ پیاس کا معلوم ہونا۔ غذا کا ہضم ہونا وغیرہ وغیرہ کوئی انسان اس امر پر سزا نہیں دیا جاتا کہ وہ سانس کیوں لیتا ہے۔ اُسے بھوک اور پیاس کیوں لگتی ہے۔ اُسکی غذا کیوں ہضم ہو جاتی ہے اس کا دل کیوں حرکت کرتا ہے آنکھوں سے دیکھتا کیوں ہے۔ پیروں سے چلتا کیوں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ یہ فطرتی تقاضے ہیں۔ ان باتوں میں انسان تمام حیوانات سے اشتراک رکھتا ہے اگرچہ اسکی ہر چیز ترقی یافتہ ہے مگر ہے مشترک۔ اسے حیوانی طبعی تقاضا کہا جائیگا۔ مگر انسان میں ایک دوسری ہستی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جسکے ظہور کو ریزن (عقل) کہتے ہیں۔ یعنی انسان علاوہ فطرتی حیوانی طبعی تقاضاؤں اور قوتوں کے دوسری خاص قسم کی قوتیں بھی رکھتا ہے جو ان سب سے مختلف ہیں۔ اور ان قوتوں کے ماتحت وہ اپنے تئیں پہچانتا۔ سمجھتا۔ فہم و ادراک رکھتا۔ تمیز رکھتا۔ غور و فکر کرتا۔ اپنے ارادہ سے سمجھ بوجھکر ایک کام کرتا اور اس کا بُرا بھلا نتیجہ سمجھتا اور جانتا اور اپنے کاموں کا ذمہ وار ٹھہرتا ہے وغیرہ وغیرہ یہ وہ صفات ہیں جن سے وہ صحیح معنوں میں انسان کہلاتا ہے۔ اور انہی صفات پر تمام قانونی ذمہ واریاں عائد ہوتی ہیں۔ خواہ وہ قوانین مذہبی ہوں یا سیاسی۔ تمدنی و معاشرتی یا کسی سوسائٹی کے۔ مثلاً محض کھانے پر تو گرفت نہیں۔ مگر ناجائز چیزیں کھانے پر سزا دی جاتی ہے۔ دیکھنا تو جرم نہیں۔ مگر ناجائز نگاہ گناہ ہے۔ غرضیکہ تمام دنیا میں انسان کی فطرتی حیوانی ہستی اور ارادی انسانی ہستی میں فرق کیا جاتا ہے اور خود نفس انسانی بھی اپنی ارادی انسانی ہستی کو اپنی فطرتی حیوانی ہستی سے الگ سمجھتا ہے اور دونوں بالکل علیحدہ علیحدہ صفات رکھتی ہیں۔ اگر صفات سے ہی کسی ہستی کا وجود ثابت ہوا کرتا ہے تو پھر انسان میں ایک اور علیحدہ ہستی کا

ثبوت ظاہر ہے جو اپنے قول و فعل کی ذمہ وار اور جزا سزا کی محل ہے۔

(ج) کسی بدی پر نفس کی ملامت۔ ثابت کرتی ہے کہ نفس اپنے اندر بصیرت رکھتا ہے کہ میں نے بدی کا بدلہ بُرا پانا ہے اگر ایسا نہیں تو نفس اُس کو بُرا کیوں سمجھتا اور اُس سے کیوں ڈرتا ہے اور نفس بُرا اُسی کو سمجھتا ہے جو اُسکی ترقی اور بقا میں حارج ہو۔ گویا نفس ٹھیک ویسے ہی بدی سے ڈرتا اور اُس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے جیسے کہ ایک بکری جس نے تمام عمر بھیڑیا نہ دیکھا پھر بھی اُس کے سامنے لائے جانے پر اُس سے محض فطرتی طور پر ڈرے اور بچیگی۔ گویا اُسکی فطرت کی نگاہ دیکھ رہی ہے کہ بھیڑیا اُسے ہلاک کر دیگا اسی طرح نفس انسانی کی بصیرت محسوس کرتی ہے کہ بدی کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ اسی لیئے وہ انسان کو بدی سے بچنے کے لیئے اندر ہی اندر ملامت کرتی ہے تاکہ اُسکی بقا کی راہ میں حرج نہ ہو۔ پس نفس کا بدی پر ملامت کرنا بقائے نفس پر دلیل ہے۔

(د) تخیل۔ لوگ تو کہدیتے ہیں کہ خواب خیال واہیات بات ہے۔ مگر در اصل قوّت متخیلہ ہی تمام علوم کی جڑھ ہے۔ خیال کی وسعت سے کسی کو انکار نہیں۔ اور وسعت کیوں ہے؟ اس لیئے کہ وہ جسم کا پابند نہیں۔ جسم سے علیحدہ ہو کر ہی وہ تمام آسمانوں ستاروں بادلوں کی سیر کرتا اور طبقات الارض کی خاک چھانتا۔ سمندر کی تہ میں غوطہ لگاتا اور ان باریک در باریک چیزوں کی تہ تک پہنچتا ہے جہانتک کہ تیز سے تیز دُوربین یا خوردبین بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اور اس طرح طرح طرح کے گوہر مقصود ہاتھ میں لاتا اور علوم ظاہری و باطنی کو مالا مال کر دیتا ہے۔ پس ظاہر ہے کہ خیال نیستی تو نہیں بلکہ ہستی ہے۔ کھٹّی چیز کا خیال کرو تو مُنہ میں پانی بھر آتا ہے۔ پھر اسی قوّت متخیلہ اور قوّت ارادی کو ترقی دینے سے مسمریزم کا علم پیدا ہوتا ہے۔ ان باتوں سے صاف ثابت ہے کہ خیال ایک ہستی رکھتا ہے چونکہ اس کا مبدا بھی جسم اور نفس انسانی ہے۔ اسلیئے خیال کی ہستی نفس انسانی کا ہی ایک ظہور ہوا جو کہ جسم سے ایک خاص رنگ میں علیحدگی بھی پکڑ سکتا ہے۔ اگر نفس انسانی کی علیحدہ ہستی نہ ہوتی اور وہ جسم سے علیحدہ نہ رہ سکتا تو خیال کی یہ جولانیاں بھی نہ ہوتیں کہ جسم سے الگ وہ بطور خود دُور دراز ملکوں کی سیر کرتا۔ یہ خیال آسکتا ہی نہ تھا کہ اگرچہ جسم اِس جگہ ہی موجود ہے۔ مگر میں فلاں دُور دراز مقام میں ہوں۔ یہ بھی نفس کی ایک بیّن شہادت ہے کہ وہ خود اپنے تئیں جسم سے علیحدگی میں محسوس کرتا ہے۔

(س) **رؤیا۔ کشف** - رؤیا کا بھی ایک سلسلہ ہے جس میں یہ نظارہ ہر ایک نفس انسانی نہ صرف محسوس کرتا بلکہ کھلے طور پر دیکھتا ہے کہ اس ظاہری جسم سے علیحدہ صاف طور پر چلتا پھرتا۔ کھاتا پیتا۔ کام کرتا۔ خوشی و غم۔ لذت اور درد کو محسوس کرتا ہے۔ رؤیا کو خواہ قوت متخیلہ کا نتیجہ کہو خواہ الہام کا ایک شائبہ کہو۔ دونوں صورتوں میں نفس کی گواہی قائم رہتی ہے۔ یعنی نفس انسانی اس ظاہری جسم سے علیحدہ ایک اور ہی ہستی میں ہو کر خوشی و غم۔ لذت و درد کو محسوس کرتا۔ کھاتا پیتا اور کام کرتا ہے۔ گویا اپنی علیحدہ ہستی رکھتا ہے جو اس ظاہری جسم کو چھوڑ کر بھی قائم رہتی ہے۔ یہ مشاہدہ اور تجربہ ہے اور کشف تو عین بیداری کے وقت ہوتا ہے اور اس میں انسان صاف طور پر اپنے تئیں اس ظاہری جسم سے علیحدہ ایک اور ہی لطیف محض ہستی میں پاتا ہے۔ یہ ہزارہا راستبازوں کا تجربہ ہے کہ سلسلۂ کشوف و رؤیا الہامی بھی ہوتا ہے۔ جو صدہا غیبی اور باطنی علوم کو کھولتا ہے۔ اور جس کے ذریعہ قبل از وقوع کسی امر کے پتہ لگ جاتا ہے۔ اگر کسی شخص نے خود تجربہ نہیں کیا تو اس سے واقعات کا انکار نہیں ہو سکتا۔ تجربوں کا انکار سائنس کا انکار ہے۔ کیونکہ سائنس کے تجربے بھی ہر ایک نہیں کیا کرتا۔ پھر ایسے راستباز لوگوں کے تجربوں کا انکار تو عقل کا انکار ہے جو کسی حالت میں بھی جھوٹ بولنا جائز نہیں سمجھتے خواہ انکی جان چلی جائے یا دنیا غرق ہو جائے۔ مگر میں اس شخص سے پوچھتا ہوں جو الہام کا منکر ہے اور جو رؤیا کو محض نفس کا نتیجہ مانتا ہے کہ وہ رؤیا جو صحیح نکلتی ہیں کیا ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جو کچھ رؤیا میں دیکھا گیا وہ صحیح تھا۔ اگر رؤیا نے عالم ظاہر میں پورا ہو کر ثابت کر دیا کہ رؤیا میں جو کچھ دیکھا گیا صحیح تھا۔ چنانچہ جو کچھ دیکھا گیا وہ پورا ہو کر رہا۔ تو کیا یہ بھی رؤیا میں نہ دیکھا گیا تھا کہ نفس انسانی ایک علیحدہ ہستی جسم ظاہر سے رکھتا اور اس سے علیحدہ اپنے وجود کو قائم رکھتا اور تمام لذات و درد و خوشی و غم کو محسوس کرتا ہے۔ اور جو کچھ دیکھا گیا ہے پورا ہو کر رہے گا یعنی نفس انسانی جسم ظاہر سے علیحدہ ہو کر اپنی ہستی کو قائم رکھے گا اور لذات و درد خوشی و غم سب کو محسوس کریگا۔

(س) **اسپریچولزم اور کشف قبور**۔ زمانۂ قدیم سے مشرق کے بعض صوفیوں سے یہ بات چلی آتی ہے کہ وہ لوگ مجاہدات سے نفس کی حالت کو اس قابل بنا لیتے تھے کہ دوسرے

نفوس یعنی ارواح سے جو جسم خاکی چھوڑ چکی ہیں ملاقات کر لیا کرتے تھے۔ اور اسکو کشف قبور کہا کرتے تھے اس زمانہ میں مغرب میں بھی یہ علم پھیل گیا ہے۔ چنانچہ اسپریچولسٹ لوگ امریکہ اور یورپ میں روحوں سے ملاقات کرتے اور اس کا نام اسپریچولزم رکھتے ہیں اور اس طرح پر بقائے نفس پر گواہی دیتے ہیں۔

(ص) وہ لوگ جو راستباز ہوتے ہیں اور خدا کے برگزیدہ ہوتے ہیں اور بوجہ کمال نیکی اور تقویٰ اور مجاہدات کے نفس کی حالت کو نہایت ترقی دیتے اور اُسے ہر قسم کی کثافت اور کدورت سے پاک رکھتے ہیں وہ سب کے سب خواہ کسی ملک اور زمانہ میں ہوں اس بات کے قائل پائے جاتے اور گواہی دیتے ہیں کہ نفس انسانی فنا نہیں ہوتا بلکہ موت نفس کی ترقی اور آزادی کے لیئے ایک دروازہ ہے۔ اُنکی گواہی دوسرے انسانوں سے بہت زیادہ قابل قدر ہے۔ کیونکہ انکا نفس بہت ترقی یافتہ اور اُنکے اندر نفس کی آواز نہایت صاف اور ہر قسم کی آمیزش سے پاک ہوتی ہے۔

(۵) خالقِ کائنات یعنی خدا کی گواہی

الہام کی ضرورت پر مَیں پہلے تفصیل سے لکھ چکا ہوں۔ اور یہ ثابت کر چکا ہوں کہ جن معاملات میں عقل کی رسائی پوری طرح سے مشکل ہوتی ہے انہیں یقین پر پہنچنے کیلئے الہام کی رہبری کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اسی لیئے الہام کی ضرورت ہے۔ ہاں کسی الہام کے منجانب اللہ ہونے کے ثبوت کے لیئے یہ ضروری ہے کہ مدعی الہام راستباز ہو۔ اور الہام سے الٰہی علم اور قدرت ظاہر ہوتی ہو۔ یعنی ایسے علوم صحیحہ پر مشتمل ہو کہ انسان اُس کی مثال لانے سے عاجز ہو اور ایسے امور غیبیہ بطور پیشین گوئیوں کے اُس میں مندرج ہوں کہ انسانی علم وہاں تک پہنچنے سے عاجز و قاصر ہو۔ اور اُن باتوں یا پیشین گوئیوں کے پورا کرنیکے لیئے باوجود بے سروسامانی کے خدا کی طرف سے ایسے اسباب اور سامان ہو جائیں جو کہ انسان اپنی کوشش سے مہیا کرنے کے ناقابل ہو اور پھر کوئی انسانی کوشش اُنہیں نہ ٹال سکے تا ظاہر ہو کہ یہ کام کاروبار انسانی نہیں بلکہ خود خدا کی قدرت نمایاں ہیں۔ مَیں پہلے ثابت کر چکا ہوں کہ کوئی الہامی کتاب انسانی دستبرد سے محفوظ ہونے کا دعویٰ سوائے قرآن کریم کے نہیں کر سکتی

اور کوئی ملہم من اللہ دنیا میں سوائے محمد مصطفٰے صلعم کے نہیں جس کی تاریخ زندگی اور سوانحعمری تمام و کمال محفوظ اور دنیا کے سامنے ہو تاکہ اُسپر غور کیا جاسکے۔ پس ایسی صورت میں ہم قرآن کریم کو ہی لیں گے اور اُسے مذکورہ بالا معیار سے پرکھیں گے۔

(۱) مدعی الہام کی راستبازی۔ یہ امر تاریخ سے ثابت ہے کہ حامل قرآن حضرت محمد مصطفٰے صلعم کی زندگی ایسی پاک اور بے لوث اور معصوم تھی اور آپ راستبازی کے ایسے اعلیٰ معراج پر تھے کہ قوم کی طرف سے دعوائے رسالت سے پہلے صادق اور امین کہلاتے تھے چنانچہ قرآن کریم بھی فرماتا ہے کہ فقد لبثت فیکم عمراً من قبلہٖ افلا تعقلون ہ یعنی اس سے پہلے ایک عمر یعنی چالیس سال تک تم میں زندگی بسر کی پھر کوئی تم نے میرا جھوٹ یا افترا آجتک دیکھا۔ پھر کیوں نہیں عقل سے کام لیتے؟ کیا اب مَیں خدا پر افترا باندھونگا جس سے بڑھکر کوئی ظلم نہیں۔ یاد رہے کہ چالیس سال تک جس چیز کا انسان پابند رہے وہ اُس انسان کی عادت کیا بلکہ فطرت ثانیہ ہوجاتی ہے۔ اُس کے برخلاف کرنا اُسکے لیئے محال ہوتا ہے۔ ایک قوم جس کے درمیان آپنے لڑکپن اور جوانی گذاری ہو۔ اور جو آپکے تمام حالات سے خوب واقف ہوں اُن کے سامنے بطور دلیل کے اپنی پاک اور معصوم زندگی کو پیش کرنا اور پھر تحدی کرنا کہ میرا کوئی گناہ یا جھوٹ یا افترا بھلا بتلاؤ تو بھی ایسا کام ہے کہ جرت ہوجاتی ہے اور کسی انسان کا حوصلہ نہیں کہ ایسا کرسکے جب تک اُس کو پورا یقین اپنی عصمت پر نہ ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ وہ مکہ کے منکرین اس دعوے کو نہ توڑ سکے پس ایک شق یعنی مدعی الہام کی راستبازی تو ثابت ہو چکی۔

(ب) علم اور قدرت۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ "وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہٖ وادعوا شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صادقین ہ فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ۔ اور اگر تمھیں شک ہو اُس چیز سے جو ہم نے اپنے بندہ (محمد مصطفٰے صلعم) پر نازل کی تو پس لے آؤ اس کی مانند ایک سورۃ۔ اور خدا کے سوا جتنے تمھارے مددگار ہوں سب کو بلا لو اگر تم سچے ہو۔ پس اگر تم ایک سورۃ بھی اسکی مثل نہ لاسکے اور تم ہرگز ہرگز نہیں لاسکو گے تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہیں"۔ یہ تحدی اُسی وقت کیلیئے نہیں تھی

بلکہ تیرہ سو برس گذر گئے اور یہ ابھی تک اسی طرح موجود ہے۔ قرآن کے مخالفوں نے قرآن کی تکذیب اور تردید کے لیے ناخنوں تک زور لگائے مگر اس تحدی کو نہ توڑ سکے جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ یہ دعویٰ اور تحدی جناب الٰہی کے علم اور قدرت سے تھا۔ ورنہ انسانی دعوے کو توڑ دینا کونسی بڑی مشکل بات ہوا کرتی ہے اور پھر جبکہ کثرت سے لوگ مخالفت کرتے رہتے ہوں اور ہر طرح کی زک دینے کی کوشش میں لگے رہتے ہوں۔

پھر جو پیشین گوئیاں قرآن کریم نے فرمائیں وہ ایسی تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انسانی علم سے نہ تھیں کیونکہ وہ ایسے امور غیبیہ پر مشتمل تھیں جو بظاہر انسانی نگاہ اور عقل سے بالکل دور تھے بلکہ عقل تو اس کے برخلاف فتویٰ دیتی تھی۔ مثلاً جناب محمد مصطفےٰ صلعم جب مبعوث ہوئے تو آپ اس وقت بالکل بے کس و بے بس تھے نہ روپیہ نہ پیسہ۔ نہ دولت نہ خزانہ۔ نہ فوج نہ ہتھیار نہ جماعت نہ سلطنت۔ محض یکہ و تنہا مکہ کی گلیوں میں وعظ کرتے پھرتے تھے اور لوگ اس میں بھی حارج ہوتے تھے۔ آپکی مخالفت کرنیوالے جو لوگ تھے وہ روپیہ۔ حکومت۔ جتھا۔ سپاہ سب ہی کچھ رکھتے اور سوا خدا کے تمام زمانہ آپکا دشمن تھا۔ کفار مکہ کے علاوہ یہود و نصاریٰ۔ خاص عرب سرداروں اور قبائل کے علاوہ اردگرد کی سلطنتیں ایران و روم و مصر کے بادشاہ سب ہی تو چاہتے تھے کہ آپ کے دین کو ملیامیٹ کر دیں اور آپ کو نیست و نابود کر دیں۔ اس وقت آپ نے پیشین گوئی کی میں بشیر و نذیر ہوں جو میری اتباع کریگا وہ کامیاب ہوگا اور جو میری مخالفت کرے گا وہ ذلیل و ہلاک ہوگا چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے قل للذین کفروا ستغلبون و تحشرون الی جھنم و بئس المھاد ۰ انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیوۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد ۰ کہدے اُن لوگوں کو جو منکر ہیں اور تیری مخالفت کرتے ہیں کہ عنقریب تم مغلوب کیئے جاؤ گے اور ہلاک ہو کر جہنم کی طرف جمع کیئے جاؤ گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔ بے شک ہم اپنے مرسلوں اور کامل مومنوں کو جو ہمارے کہے پر چلتے اور ہمیں مانتے ہیں نصرت و امداد و تائید دیتے رہے اور دیتے رہیں گے اس دنیا میں بھی اور قیامت کے دن بھی اسی قسم کی اور بھی آیات ہیں جن میں صاف صاف فرما دیا ہے کہ تم ہلاک اور ذلیل و خوار ہوگے اور میں اور میرے متبعین کامیاب اور مظفر و منصور ہوں گے۔ ان پیشین گوئیوں کے مخالفین

بھڑک اُٹھے اور اُنہوں نے نبی کریم صلعم کے مار ڈالنے کی کوشش میں کوئی دقیقہ نہ اُٹھا رکھا۔ اور آپ کے متبعین کو نہایت سخت دُکھ دیکر مجبور کیا کہ وہ لوگ وطن چھوڑ کر غیر ممالک کو نکل جائیں۔ مگر وہ تو اُس طرف اپنی کوششوں میں ناخنوں تک زور لگا رہے تھے اور اِدھر پیشین گوئیوں میں تحدی کا رنگ اور بڑھ گیا۔ چنانچہ قرآن کریم فرماتا ہے۔ واللہ یعصمک من الناس۔ یعنی اللہ تجھے لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔ کوئی تجھے مار نہ سکیگا۔ پھر فرماتا ہے والذین ھاجروا من بعد ما ظلموا۔ لنبوئنھم فی الدنیا حسنۃ ولاجر الاخرۃ اکبر۔ اور جن لوگوں کو مخالفین کے ظلم کی وجہ سے گھر چھوڑ کر نکل جانا پڑا۔ ہم ضرور ضرور اسی دنیا میں اُنہیں اچھے ٹھکانے سے بٹھا دینگے اور دنیا میں وہ عمدہ اور اعلیٰ ہو کر رہیں گے اور ضرور آخرت کا اجر بہت بڑھ چڑھ کر ہوگا۔ کیا یہ انسان کا کام ہوسکتا ہے کہ جس وقت چاروں طرف سے ماریں پڑ رہی ہوں اور سر چھپانے کو جگہ نہ ملتی ہو اُسوقت اس قسم کی پیشین گوئی کرے اور پھر تحدی کرے اور بعد میں باوجود ہر قسم کی مخالف طاقتوں کی سر توڑ کوششوں کے وہ باتیں سچ ثابت ہوں اور وہ لوگ جن کو گھر چھوڑ کر بھاگنا پڑا جیسا کہ پہلے سے کہا گیا تھا مظفر و منصور ہوں۔ اور دنیا میں خدا انہیں ایسے عمدہ طریق پر متمکن کرے کہ قیصر و کسرٰے کی سلطنتیں اُنکے قدموں پر آکر پڑیں اور وہ شہنشاہ بنجائیں اور ظاہر و باطن دونوں کے لیئے دنیا کے پیشوا ہوں۔ پس ظاہر ہے کہ یہ کلام جو ایسی عجیب و غریب پیشین گوئیاں اپنے اندر رکھتا ہو اور جن کے پورا کرنیکے لیئے ایسی عظیم الشان قدرتیں نمایاں ہوں وہ خدا کے سوا اور کسی کا کلام نہیں ہوسکتا جو علم تام اور قدرت کاملہ کا مالک ہے اور مسبب الاسباب اور علیٰ کل شئی قدیر ہے۔

پس جب یہ ثابت ہوگیا کہ یہ خدا کا کلام ہے تو پھر اگر خدا کے کلام سے یہ ثابت ہو جائے کہ موت زندگی کا خاتمہ نہیں بلکہ موت کے بعد ایک اور عالم ہے جو دار الجزا ہے تو پھر انکار اور عذر کی کوئی گنجایش نہیں رہتی۔ مگر قرآن کریم ایک اور بھی التزام کرتا ہے کہ ما بعد الموت زندگی کے لیئے ریاضی کے مسلمہ قاعدہ اربعہ متناسبہ کو کام فرماتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا آیات ہی پر غور کرو۔

(۱) قل للذین کفروا ستغلبون وتحشرون الی جھنم و بئس المھاد ہ

(۲) انا لننصر رسلنا والذین اٰمنوا فی الحیوٰۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد ہ

(۳) والذین ھاجروا من بعد ما ظلموا۔ لنبوئنھم فی الدنیا حسنۃ ولاجر الاخرۃ اکبر۔

(۱) کہدے کافروں کو عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور ہلاک ہو کر جہنم کی طرف جمع ہو گے اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

اس میں دو خبریں دی ہیں ایک دنیا کے متعلق اور دوسری آخرت کے متعلق۔ دنیا میں مغلوب ہونا اور آخرت میں عذاب ہونا۔ تیسری بات یہ ہے کہ وہ قومیں سب کی سب بارعب صاحب حشم و جاہ و مالکِ حکومت و سپاہ تھیں اور مخالفت میں سر توڑ کوششیں کر رہی تھیں۔ مگر آخر وہ سب کی سب ناکام و نامراد خائب و خاسر اور مغلوب ہو گئیں۔ دیکھو دنیوی خبر اور اخروی خبر دو خبریں تھیں اور انکے مقابلے میں دو واقعات تھے جن کے متعلق وہ خبریں تھیں۔ ایک خبر نے اپنے واقعہ کے ساتھ صداقت کی مہر لگا دی ہے کہ دوسری خبر عذاب قیامت بھی اپنے واقعہ کو ضرور لائے گی۔

(۲) بے شک ہم اپنے رسولوں اور کامل مومنوں کی ضرور دنیا میں بھی مدد کرینگے اور قیامت میں بھی۔

(۳) اور جن لوگوں کو مخالفوں کے ظلم سے گھر بار خدا کے لیئے چھوڑنا پڑا ہم دنیا میں انہیں نہایت عمدہ اور اعلیٰ ٹھکانے سے بٹھائیں گے اور آخرت کا بدلہ تو بہت بڑھ چڑھ کر ہوگا۔

اب دیکھو ان میں دو خبریں ہیں ایک یہ کہ دنیا میں خدا کی نصرت اور تائید رسول اور اسکے متبعین کے ساتھ اور مہاجرین کے لیئے عمدہ شوکت و سلطنت ہے۔ دوسرا عظیم الشان اجر قیامت کے دن کا۔ یہ خبر اسوقت دیگئی جبکہ رسول۔ اور انکے متبعین اور مہاجرین کی حالت نہایت بے کسی اور بے بسی کی تھی۔ اور وہ چاروں طرف سے دُکھ دیئے اور پیسے جا رہے تھے۔ اب دنیا کے متعلق جو خبر تھی وہ اسی طرح جس طرح پہلے سے بتلایا گیا تھا پوری ہوتی ہے جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ دوسری خبر بھی جو دراصل پہلی خبر کا ہی پچھلا نصف حصہ تھا۔ وہ بھی پورا ہو کر رہیگا۔

پس قرآن کریم نے باوجود اپنے الہامی ہونے پر بیّن نشان اور دلائل پیش کرنیکے اور اسطرح اسکے الہامی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ ہونیکے صرف یہی نہیں کیا اس بات کو بڑے زور و شور اور تاکید سے پیش کیا کہ موت کے بعد زندگی ضروری ہے بلکہ اسے ارجہ متناسبہ کے رنگ میں ان [illegible] کے ساتھ بھی بیان کر کے جو اسی دنیا کے متعلق تھیں اور جو من و عن پوری ہوئیں اسے اور زیادہ مدلل اور ....

صاف کردیا ہے۔ وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین ::

راقم خاکسار بشارت احمد عفی عنہ

انجیلی کفّارہ

(نمبر ۲)

(۵) - باب ۵ - ورس ۲۷ تا ۳۲ - **مضمون** :- تم سن چکے ہو کہ اگلوں سے کہا گیا تو زنا نہ کر پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو کوئی شہوت سے کسی عورت پر نگاہ کرے وہ اپنے دل میں اُس کے ساتھ زنا کر چکا سو اگر تیری داہنی آنکھ تیرے ٹھوکر کھانے کا باعث ہو اُسے نکال اور اپنے پاس سے پھینک دے کیونکہ تیرے انگوں میں سے ایک کا نہ رہنا تیرے لیئے اس سے بہتر ہے کہ تیرا سارا بدن جہنّم میں ڈالا جائے یا اگر تیرا داہنا ہاتھ تیرے لیئے ٹھوکر کھانے کا باعث ہو اُس کو کاٹ ڈال اور اپنے پاس سے پھینک دے کیونکہ تیرے انگوں میں سے ایک کا نہ رہنا تیرے لیئے اس سے بہتر ہے کہ تیرا سارا بدن جہنم میں ڈالا جائے - یہ بھی لکھا گیا کہ جو کوئی اپنی جورو کو چھوڑ دے اُسے طلاق نامہ لکھدے پر میں تمہیں کہتا ہوں کہ جو کوئی اپنی جورو کو زنا کے سوائے چھوڑ دیوے اُس سے زنا کرواتا ہے اور جو کوئی اُس چھوڑی ہوئی سے بیاہ کرے زنا کرتا ہے۔

تنقید - اس تعلیم اور اس وعظ سے بھی بہت سی باتوں پر روشنی پڑتی ہے حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے۔

(الف) اگر تیری داہنی آنکھ -

(ب) تیرا داہنا ہاتھ -

تیری ٹھوکر کا باعث ہو تو اُسے نکال اور کاٹ ڈال اگر ہم یہ مان لیں کہ کفارہ ماننے والوں سے بلحاظ بشریت ایسی غلطیاں نہیں ہوتی ہیں تب تو کوئی مزید بحث ہو ہی نہیں سکتی لیکن اگر یہ نہ مانا جائے تو یہ کہا جائیگا کہ کفارہ پرست کی اگر آنکھ یا ہاتھ کوئی لغزش کھائے تو اُس کے واسطے دو صورتیں ہیں پہلی صورت تو یہ ہے کہ آنکھ نکال دے اور ہاتھ کاٹ ڈالے کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام کا یہی حکم ہے اور اگر کفارہ پر عقیدہ ہونے کی وجہ سے ایسا نہ کیا جائے تو پھر اس حکم کی تعمیل کیسے ہو لازمی ہے کہ آنکھ نکال دی جائے اور ہاتھ کاٹ ڈالیں اگر ایسا ہو تو کفارہ باطل ہے کیونکہ وہ کفیل

ہو چکا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ آنکھ نکالنے اور ہاتھ کاٹنے سے ملزم اُس سزا سے بچ جائینگے جو قدرتی سزا ہے جو کفارہ کا اثر ہے تو کہا جائے گا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے جو یہ سزائیں مقرر کی ہیں وہ قطعی نہیں کیونکہ جس آنکھ اور جس ہاتھ نے قصور کیا تھا وہ سزا پا چکے ہیں اور اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ ایسا کرنے سے سارا جسم جہنم میں نہیں جائے گا ہاں اگر آنکھ اور ہاتھ نکالی اور کاٹا نہ گیا تو اُس صورت میں سارا جسم جہنم میں جائے گا اس فقرہ نے فیصلہ ہی کر دیا ہے جس کا قصور تھا اُس نے سزا پالی اگر کہا جائے کہ روح کو سزا ملے گی تو کہا جائے گا کہ جب باقی کا جسم محفوظ رہا تو روح کیوں نہ محفوظ رہے جو روح کی تمثیل سے بھی کفارہ باقی نہیں رہتا فرض کر لو (۱ئے) کفارہ پرست ہے وہ ایک ایسی عورت سے شادی کرتا ہے جسکو محض زنا کی وجہ سے طلاق نہیں دی گئی اُس صورت میں اُس کا کیا حشر ہوگا کفارہ اُسکو بچا نہیں سکتا کیونکہ وہ خلاف تعلیم حضرت مسیح علیہ السلام کے شادی کر چکا ہے اگر کہا جائے کہ عیسائیوں میں زنا کے سوائے طلاق نہیں تو یہ صحیح اور راست نہیں کیونکہ اس وقت امریکہ اور دیگر حصص یورپ میں اور وجوہ سے بھی طلاق ہو سکتی ہے۔

(۶) باب ۶ - ورس ۲ و ۳ - مضمون - خبردار ہو کہ تم اپنے نیک کاموں کو لوگوں کے سامنے دکھلانے کے لیئے نہ کرو نہیں تو تمہارے باپ سے جو آسمان پر ہے اجر نہ ملے گا۔

تنقید - حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں اگر تم ریا سے عبادت کرو گے تو خداوند کریم کی درگاہ سے تمہیں اجر نہیں ملے گا اس حکم کو اس وعظ میں یہ مان لیا گیا ہے کہ جو عبادت خالصاً للہ کی جائے گی اُس کا بارگاہ صمدی سے اجر ملے گا اس میں کفارہ کی شرط نہیں ہے اگر یہ کہا جائے

ٹ۵ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک موقعہ پر حضرت مسیح علیہ السلام نے یہ فرمایا ہے کہ وقت مقررہ تک توریت شریف کا ایک شوشہ اور ایک نقطہ بھی نہیں ٹل سکتا اور اس وعظ میں شوشہ اور نقطہ تو جدا رہا طلاق کے متعلق حکموں کو ہی تبدیل کیا جاتا ہے توریت میں یہ حکم ہے کہ طلاق دی جائے اور حضرت ممدوح فرماتے ہیں کہ سوائے زنا کے طلاق ہو ہی نہیں سکتی اگر یہ تبدیلی نہیں ہے تو اور کیا ہے کیونکہ طلاق کے بارہ میں توریت شریف کی تعلیم اور احکام جو اس سے پیشتر واضح تر اور روشن ہیں اُن میں ترمیم کرنا اُن کو بدلنا اور ٹلانا ہے جو پہلے حکم مسیحی کے متضاد ہے

فافہم -

کہ ضمناً کفارہ ہی سے مراد ہے تو کہا جائے گا کہ اول تو کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے جو کفارہ پر دال ہو اور اگر یہ کھینچا تانی سے بن بھی سکتا ہے تو پھر یہ کہا جائیگا کہ جو لوگ قبل از مصلوبیت حضرت مسیح علیہ السلام کے جہان سے گذر گئے اور ریا سے عبادت نہیں کرتے تھے انکو اس حکم کے مطابق اجر ملے گا یا نہیں اگر ملے گا تو کفارہ باطل ہوتا ہے اور اگر نہیں ملے گا تو حضرت مسیح کا ارشاد نعوذ باللہ کوئی معنے نہیں رکھتا۔

(۷)۔ باب ۶ ۔ ورس ۱۴ ۔ **مضمون** ۔ اس لیئے کہ اگر تم آدمیوں کے گناہ بخشوگے تو تمہارا باپ بھی جو آسمان پر ہے تمہیں بخشے گا پر اگر تم آدمیوں کو اُن کے گناہ نہ بخشوگے تو تمہارا باپ بھی تمہارے گناہ نہ بخشے گا۔

تنقید۔ یہ ہدایات بہت واضح اور صاف ہیں ٹھنڈے دل سے ہر سوچنے والا سوچ سکتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا ان ہدایات سے کیا مدعا اور کیا مطلب تھا دور از قیاس تاویلات نے معاملہ ایک اُلجھن میں جا پڑتا ہے ان آیات میں صاف طور پر یہ کہا گیا ہے کہ اگر تم اس دنیا میں اپنے ابنائے جنس گنہگاروں کے گناہ بخشوگے تو تمہارا باپ (خدا) بھی آسمان پر تمہارے گناہ بخشے گا اور اگر تم ایسا نہیں کروگے تو تمہارے گناہ بھی تمہارا باپ آسمان پر نہیں بخشے گا کفارہ کی صورت میں بصورت بحث عدل۔ رحم اور قدوسیت کے بڑا اہم سوال یہی ہے کہ بغیر کفارہ یا مصلوبیت حضرت مسیح علیہ السلام کے قادر مطلق اور غفور الرحیم گنہگاروں کے گناہ بخش ہی نہیں سکتا اور ان آیات میں حضرت مسیح علیہ السلام خداوند کریم کے یہ اختیارات باقی اور برقرار رکھتے ہیں شرط یہ ہے کہ اگر اس دنیا میں لوگ ایک دوسرے کے گناہ بخشیں تو خدا بھی اُنکو بخش دے گا ایک شخص جو کفارہ پر اقرار اور ایمان نہیں رکھتا اگر اپنے بھائیوں اور ابنائے جنس کے گناہ بخشتا ہے تو ضرور ہے کہ آسمان پر بھی خدا اُس کے گناہ بخشے کیونکہ خداوند کریم کے ان اختیارات کے نفاذ کے واسطے کفارہ کی شرط نہیں لگائی گئی ہے اور اگر خداوند کریم قادر مطلق نہیں بخش سکتا تو جو وعدہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ان آیات میں کیا ہے وہ کالعدم ٹھہرتا ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ خداوند کریم کے ایسے اختیارات صرف اسی دنیا میں نفاذ پذیر ہوسکتے ہیں قیامت یا حشر اور زندگی ثانی سے انکا کوئی تعلق

نہیں ہے تو پھر یہ کہا جائے گا کہ خداوند کریم اس دنیا میں جب گنہگاروں کے گناہ بخش سکتا ہے تو کیوں زندگی ثانی میں بخش نہیں سکتا اور ان حالات میں کفارہ کی عظمت بھی وہ نہیں رہتی جو رہنی چاہیئے کیونکہ خداوند کریم کے اختیارات بخشش کسی نہ کسی صورت میں باقی رہ جاتے ہیں تمام ان سب آیات میں شرطیہ بیان کیا گیا ہے جس سے ظاہر اور ثابت ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام خدائی اختیارات کے نفاذ میں اسقدر تنگدل نہ تھے جسقدر کفارہ کا مسئلہ یقین دلاتا ہے۔

(۸) باب ۷ ورس ۲۱ تا ۲۳ - **مضمون** - نہ ہر ایک جو مجھے خداوند خداوند کہتا ہے آسمان کی بادشاہت میں شامل ہوگا مگر وہی جو میرے باپ کی جو آسمان پر ہے مرضی پر چلتا ہے اُس دن بہتیرے مجھے کہیں گے اے خداوند اے خداوند کیا ہم نے تیرے نام سے نبوت نہیں کی اور تیرے نام سے دیوؤں کو نہیں نکالا اور تیرے نام سے بہت سی کرامات ظاہر نہیں کیں اور اس وقت میں اُن سے صاف کہوں گا کہ میں کبھی تم سے واقف نہ تھا اے بدکارو میرے پاس سے دور ہو۔

تنقید - ان آیات میں حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں صرف مجھے خداوند خداوند کہنے سے ہر کوئی آسمان کی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا مگر وہی جو خدا کی مرضی پر چلتا ہے مرضی سے مراد عمل اور نیکی ہے جیسے کہ دوسری آیات ۲۴ لغایت ۲۹ اسی باب میں کہا گیا ہے کہ "پر جو کوئی میری باتیں سنتا اور اُنپر عمل نہیں کرتا وہ بے وقوف آدمی کی مانند ٹھہرے گا"

دیکھو کس صفائی سے اعمال پر نجات اور خوشنودی کا مدار رکھا گیا ہے جو لوگ اسکے خلاف خیال رکھتے تھے اُنہیں ایک سخت لفظ بدکاروں سے مخاطب کیا گیا ہے خداوند خداوند کہنے سے مطلب یہی تھا کہ بعض لوگ محض انہی الفاظ کے رٹنے سے خود کو نیکوں میں شمار ہونے کی خواہش کرتے تھے حضرت ممدوح نے اُن کا خیال توڑنے کے واسطے اس علم پر سے پردہ اُٹھا دیا اور سمجھا دیا کہ نرے خداوند خداوند کہنے سے آسمانی بادشاہت نہیں مل سکتی عمل کی بھی ضرورت ہے اگر یہ کہا جائے کہ عمل سے مراد اعتراف کفارہ ہی ہے تو یہ درست نہیں کیونکہ کفارہ عمل نہیں ہے بلکہ ایک عقیدہ اور اگر یہ کہا جائے کہ اعتراف کفارہ کی صورت میں بھی نیک اعمال کی ضرورت باقی رہتی ہے تو پھر سوال ہوگا کہ پھر کفارہ کی قیمت باقی نہیں رہتی کفارہ پر جو انحصار تھا وہ اٹھ جاتا ہے جب انحصار نہ رہا تو کفارہ نہ رہا۔

(۹) باب۸ - ورس ۱۶ و ۱۷ - **مضمون** - جب شام ہوئی تو اُسکے پاس بہتوں کو جن پر دیو چڑھے تھے لائے اور اُس نے اُن روحوں کو کلام ہی سے دُور کیا اور سب کو جو بیمار تھے چنگا کیا تاکہ جو یسعیاہ نبی نے کہا تھا پورا ہوئے کہ اُس نے آپ ہماری ماندگیاں لے لیں اور ہماری بیماریاں اُٹھالیں۔

تنقید - اس آیت سے کفارہ کا استدلال کیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت یسعیاہ علیہ السلام نے جو پیشین گوئی کی تھی وہ پوری ہوئی بجائے اسکے کہ اس ورس سے کفارہ کا ثبوت ملے اُلٹا اُسکی تردید ہوتی ہے اوّل تو اس میں یہ ذکر ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے بزور کلام بہتوں کو جن پر دیو چڑھے تھے چنگا کیا بیماری اور گناہ میں فرق ہے دیو اور بھوت کے سایہ کو دُور کرنا گناہ کا لینا یا اٹھانا نہیں ہے بلکہ ایک علاج اگر ایسا ہی تھا تو ضرور تھا کہ حضرت مسیح علیہ السلام خود بھی اُسی بیماری میں مبتلا ہو جاتے اور اگر مان بھی لیا جائے کہ گناہوں ہی کو حضرت مسیح علیہ السلام نے اُٹھا لیا تھا تو وہی خدشہ پیش ہوگا کہ مسیح علیہ السلام خود بھی گناہ معاف کر سکتے تھے اور قبل از تکمیل کفارہ کے ایسا ہوتا تھا جس سے ضرورت کفارہ کی باقی نہیں رہتی کیونکہ جب بلا وجود پذیر ہونے کفارہ کے بھی گناہ معاف ہو سکتے ہیں تو پھر کفارہ کی کیا ضرورت ہے اور جب حضرت مسیح علیہ السلام اپنے اختیارات سے لوگوں کی ماندگیاں اور بیماریاں بہ معنے گناہ لے اور اُٹھا سکتے ہیں یعنی اُن کو معاف کر سکتے ہیں تو خدائے کریم ایسا کیوں نہیں کر سکتا اگر معاف کرنیکے معنوں پر یہ آیتیں محمول ہوں تو کفارہ باقی نہیں رہتا اور اگر دوسرا پہلو لیا جائے تو یہ کہا جائے گا کہ جو شخص دوسرے کا گناہ اُٹھاتا اور اپنے سر پہ بار لیتا ہے وہ خود گنہگار ہو جائیگا دیکھو ضامن بھی ملزم کی غیر حاضری پر زیر مواخذہ آجاتا ہے۔ اس صورت میں نعوذ باللہ خود حضرت مسیح علیہ السلام بھی ناکردہ گنہگار رہے اور گنہگار ہونے یا گناہ اُٹھانے کی صورت میں کفارہ کس طرح صحیح رہ سکتا ہے اور یہ بھی کہ ان آیتوں میں صرف ماندگیاں اور بیماریاں مراد ہیں نہ کہ گناہ۔

(۱۰) باب۹ - ورس ۲ تا ۶ - **مضمون** - اور دیکھو ایک جھولے کے مارے کو جو چارپائی پر پڑا تھا اس پاس لائے یسوع نے اُن کا ایمان دیکھ کے اُس جھولے کے مارے سے

کہا اے بیٹے خاطر جمع رکھ تیرے گناہ معاف ہوئے اور دیکھو بعضے فقیہوں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ کفر بکتا ہے یسوع نے اُن کے خیال دریافت کرکے کہا تم کیوں اپنے دلوں میں بدگمانی کرتے ہو کیا کہنا آسان ہے یہ کہ تیرے گناہ معاف ہوئے یا یہ کہ اٹھ اور چل سکیں تا کہ تم جانو کہ ابن آدم کو زمین پر گناہ معاف کرنے کا اختیار ہے۔

تنقید۔ کفارہ کی بحث میں انجیل متی کی یہ آیات ایک بڑی حد تک قابل بحث ہیں ان آیات سے یہ باتیں نکلتی ہیں۔

(الف) حضرت مسیح علیہ السلام نے لوگوں کے گناہ بخشے۔

(ب) ابن آدم یعنی حضرت مسیح علیہ السلام کو زمین پر گناہ بخشنے کا اختیار دیا گیا تھا۔

(ج) یہ اختیار خدا کی جانب سے دیا گیا تھا۔

(د) بعض لوگوں نے شک کیا اور حضرت مسیح علیہ السلام نے بااختیار ہونے کی وجہ سے اُنکا شک دُور کرنے کی کوشش کی۔

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے زمین پر قبل از مصلوب ہونیکے لوگوں کے گناہ بخشے پہلا سوال یہ ہے کہ جب ابن آدم کو زمین پہ گناہ بخشنے کا اختیار حاصل رہا ہے تو خدائے کریم کو آسمان پر کیوں نہیں ہے کیونکہ جب خدا نے ابن آدم کو ایسے اختیارات دیئے تھے تو خود اُسکو ایسے اختیارات کے عمل میں لانے سے کونسی طاقت مانع ہوتی ہے اور اگر اُسکے اپنے اختیارات ایسے ہی محدود ہیں تو پھر وہ زمین پر ابن آدم کو ایسے اختیارات کے دینے کا کیا اختیار رکھتا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام نے انہی آیات میں شبہ بھی صاف کر دیا ہے فرماتے ہیں گناہ معاف کرنے بہ نسبت اس کہنے کے کہ اُٹھ اور چل بہت آسان ہے اس سے ظاہر اور ثابت ہے کہ اُنہیں زمین پر گناہوں کے بخشنے کا اختیار حاصل تھا اور یہ اختیار قبل از مصلوب ہونیکے حاصل تھا جب اُنہیں یہ اختیار حاصل تھا تو یہ کہنا کہ سوائے اقرار کفارہ کے بخشش ہو ہی نہیں سکتی درست نہیں ہے جس طرح مسیح گناہ معاف کر سکتے تھے اُسی طرح خدا بھی کر سکیگا اُنہوں نے زمین پر یہ اختیارات برتے اور خدائے لایزال آسمان پر برتے گا۔

(۱۱) باب - درس ۱۰ تا ۱۳- **مضمون** - اور یوں ہُوا کہ جب یسوع گھر میں کھانے بیٹھا دیکھو بہت سے محصول لینے والے اور گنہگار آکے اُسکے اور اُسکے شاگردوں کے ساتھ کھانے بیٹھے جب فریسیوں نے یہ دیکھا اُسکے شاگردوں سے کہا تمھارا اُستاد محصول لینے والوں اور گنہگاروں کے ساتھ کیوں کھاتا ہے یسوع نے یہ سُنکر اُنہیں کہا بھلے چنگوں کو حکیم درکار نہیں بلکہ بیماروں کو پر تم جا کے اس کے معنے دریافت کرو میں قربانی کو نہیں بلکہ رحم کو چاہتا ہوں کیونکہ میں راستبازوں کو نہیں بلکہ گنہگاروں کو توبہ کے لیئے بلانے کو آیا ہوں۔

تنقید - ان آیتوں پر اگر سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو ثابت ہے کہ کفارہ کی نہ تو کوئی ضرورت ہے اور نہ حضرت مسیح علیہ السلام کفارہ کی غرض سے مصلوب ہوئے تھے جب حضرت مسیحؑ گنہگاروں سے مل کر کھانے لگے تو فریسیوں نے اعتراض کیا کہ کیوں گنہگاروں کے ساتھ کھاتا پیتا ہے حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ جو لوگ بھلے چنگے یعنی نیک ہیں انکو حکیم کی ضرورت نہیں یعنی کسی قربانی کی ضرورت نہیں بلکہ اُنہیں جو بیمار ہیں۔ اس سے ثابت ہے کہ جو لوگ نیک ہیں اُنہیں کفارہ کی ضرورت نہیں۔ انہی آیات میں آگے چلکر فرماتے ہیں میں قربانی کے لیئے نہیں آیا ہوں بلکہ رحم چاہتا ہوں کفارہ بھی ایک قربانی ہی ہے دیکھو حضرت مسیح علیہ السلام خود ارشاد فرماتے ہیں کہ میں قربانی کے واسطے نہیں آیا ہوں بلکہ رحم کے واسطے اب یہ تاویل کیجاتی ہے کہ خدائے رحیم رحم کسطرح کر سکتا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام رحم ہی کے واسطے آئے تھے اگر رحم ثابت ہے تو کفارہ باطل ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ کفارہ ہی رحم ہے تو یہ درست نہیں کیونکہ کفارہ میں قربانی ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام یہ فرماتے ہیں کہ میں قربانی کے واسطے نہیں آیا ہوں اور دوسرے یہ کہ رحم نہ صرف اور لوگوں کے واسطے ہی مخصوص ہے بلکہ خود حضرت مسیح علیہ السلام کی ذات اقدس بھی اس میں شامل ہے حضرت مسیحؑ معصوم تھے باوجود اس معصومیت کے اُنہیں صلیب دیا جانا رحم یا شان رحم کے خلاف ہے عدالت اور انصاف تو یہ صورت اور ہی نہیں رکھتا خود رحم بھی اسکے منافی ہے اسی کلام میں یہ طے کر دیا گیا ہے کہ راستبازوں کے واسطے تو اور کسی قربانی یا کفارہ کی ضرورت نہیں ہے حضرت ممدوح فرماتے ہیں میں راستبازوں کو نہیں بلکہ گنہگاروں کو توبہ کے لیئے

بلانے کو آیا ہوں اس سے دو باتیں ثابت ہیں اوّل یہ کہ بلا اعتراف کفارہ کے بھی راستباز ہو سکتے ہیں جنہیں توبہ کی ضرورت نہیں اور یہ کہ اُس وقت بقول حضرت ممدوح راستباز بھی تھے حالانکہ بقول عیسائیوں کے آدم کا گناہ مسلسل چلا آتا تھا جب راستباز موجود تھے تو پھر گناہ نسلی نہیں ہو سکتا ان فقرات میں راستبازی سے مراد نیکی ہے اور دوسرے یہ کہ حضرت مسیح علیہ السلام گنہگاروں کے واسطے بھی صرف ایک ہی طریقہ توبہ کا بتاتے ہیں نہ کہ کوئی دوسرا طریقہ یا کفارہ۔ توبہ میں کفارہ نہیں آتا ہے کفارہ صرف یہ اعتراف ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام لوگوں کے گناہوں کے بدلے صلیب دیئے گئے توبہ میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے کی ضرورت ہے اور ساتھ ہی عمل کی بھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ نتیجہ پانے کے وقت گناہوں کا اعتراف کیا جاتا ہے جو ایک قسم کی توبہ ہی ہے تو کہا جائے گا کہ خود اناجیل سے توبہ کا اس شرط سے مشروط ہونا ثابت نہیں ہے اور نہ حضرت مسیح علیہ السلام نے ان آیات میں توبہ کی یہ تعریف کی ہے راستبازوں کو بقول حضرت ممدوح نہ تو توبہ کی ضرورت ہے اور نہ کسی کفارہ کی۔ اگر کہا جائے کہ تمام انسان گنہگار ہیں تو یہ باطل ہے کیونکہ خود حضرت موصوف علیہ السلام یہ فرما چکے ہیں کہ اس دنیا میں گنہگار اور راستباز دونوں پائے جاتے ہیں اور میں راستبازوں کے واسطے نہیں آیا ہوں فتدبر۔

(۱۲) باب ۱۱۔ ورس ۲۶۔ **مضمون**۔ میرے باپ سے سب کچھ مجھے سونپا گیا۔

تنقید۔ اگر اس آیت سے کفارہ کا استدلال کیا جائے تو درست نہیں اس میں حضور علیہ السلام صرف اُن عنایات کا ذکر فرماتے ہیں جو خداوند کریم کی طرف سے اُن پر بسلسلہ نبوت نازل ہوئی تھیں جیسے کہ اس آیت کے شروع ہی میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ چیزیں جو داناؤں اور عقلمندوں پر چھپائی گئیں وہ بچوں پر کھول دی گئیں۔ بطریق شکریہ کے یہ کلمات حضرت ممدوح علیہ السلام کے مُنہ سے نکلے ہیں نہ کہ کفارہ کے رنگ یا تبلیغ میں۔

(۱۳) باب ۱۲۔ ورس ۷ و ۸۔ **مضمون**۔ پر اگر تم اسکے معنے جانتے کہ میں قربانی کو نہیں بلکہ رحم کو چاہتا ہوں تو تم بے گناہوں کو گنہگار نہ ٹھہراتے۔

تنقید۔ اس آیت میں بھی اس عقیدہ کو توڑ دیا گیا ہے کہ شروع ہی سے حضرت آدم علیہ السلام

کے گناہ کی وجہ سے گناہ چلا آیا ہے کیونکہ اس ایں اعتراف کیا گیا ہے کہ انسانوں میں سے بے گناہ بھی ہوتے ہیں اور تاکید سے کہا گیا ہے کہ بے گناہوں کو گنہگار قرار دینا درست نہیں اور یہ کہ میں قربانی کے لیئے نہیں آیا ہوں بلکہ رحم کے واسطے۔ ہم بادب دریافت کرینگے کہ فقرہ بے گناہوں سے حضور علیہ السلام کا مطلب کیا تھا کیا معصوم اور بے گناہ یا کچھ اور۔ اور اگر بے گناہ ہی مراد تھے تو پھر کفارہ باقی نہیں رہتا۔ اور اگر یہ مراد نہ تھی تو ایسے استدلال پر دلیل کیا ہے کیونکہ آیت کے الفاظ سے تو یہ نکلتا نہیں تاویل کا دائرہ الفاظ سے بالکل ہی نکل جانا صحیح نہیں۔

(۱۴) باب ۱۲۔ ورس ۳۱ و ۳۲۔ **مضمون**۔ اسلیئے میں تمہیں کہتا ہوں کہ لوگوں کو ہر طرح کا گناہ و کفر معاف کیا جائے گا مگر وہ کفر جو روح کے حق میں ہو لوگوں کو معاف نہ ہوگا جو کوئی ابن آدم کے حق میں برا کہے اسے معاف ہو سکے گا پر جو روح قدس کے حق میں برا کہے اُسے ہرگز معاف نہ ہوگا۔

تنقید۔ سب سے پہلے یہ بحث طلب ہے کہ روح یا روح قدس سے کیا مراد ہے خود حضرت مسیح علیہ السلام ہی کے کلام سے روح یا روح قدس سے مراد ذات خدائی ہے دیکھو اسی باب کی آیت ۲۸ میں فرمایا گیا ہے۔

"اگر میں خدا کی روح سے دیووں کو نکالتا ہوں تو البتہ خدا کی بادشاہت تم پاس آ پہنچی"۔

ان آیتوں میں حضرت مسیح علیہ السلام نے گناہوں اور کفر کی معافی کا اعلان کیا ہے اور بغیر کسی شرط کفارہ کے ہاں یہ شرط جو کفر روح کے حق میں ہو وہ لوگوں کو معاف نہ ہوگا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہرگز معاف نہ ہوگا جیسے کہ قرآن مجید میں بھی کہا گیا ہے کہ جو لوگ خدا کے ساتھ شرک کرتے ہیں وہ معاف نہیں ہوگا۔ یہاں بھی یہی مراد ہے اللہ اکبر حضرت مسیح علیہ السلام تو شرک تک ناقابل معافی قرار دیں اور دوسری طرف سے انہیں خدا کا بیٹا اور خدا کا جوڑ قرار دیا جائے۔

اگر ایک عیسائی باوجود اعتراف کفارہ کے روح کے حق میں برا کہے تو ان کلمات کے

روسے وہ معاف نہیں ہو سکتا اور اس صورت میں رشتہ کفارہ ٹوٹ جائیگا یا یہ کہ کفارہ جامع نہیں رہے گا کیونکہ کفارہ کے ساتھ یہ شرط نہیں لگائی گئی ہے کہ فلاں گناہ کی بابت وہ چل سکتا ہے اور فلاں کی بابت ساکت ہے وہ ہر ایک قسم کے گناہوں کا فدیہ ہے جس میں گناہ روح بھی شامل ہے اگر یہ قسم گناہ کی وہ اُٹھا نہیں سکتا تو وہ کامل نہیں ہے جب کامل نہیں تو باطل ہے۔

(۱۵) باب۱۲ - ورس ۳۲ - **مضمون** - پر میں تم سے کہتا ہوں کہ ہر ایک بیہودہ بات جو کہ لوگ کہیں عدالت کے دن اُس کا حساب دیں گے کیونکہ تو اپنی باتوں ہی سے راستگار گنا جائے گا اور اپنی باتوں ہی سے گنہگار ٹھہرے گا۔

تنقید - اللہ اکبر کس صفائی اور کس خوبصورتی سے اُس رہ مستقیم اور شریعت کی تصدیق اور تائید کی گئی ہے جو مذاہب کا نچوڑ ہے اور کس عمدگی سے عقیدہ کفارہ کو باطل ٹھہرایا گیا ہے جو عقل اور نقل دونوں کے خلاف ہے۔ فرماتے ہیں یوم قیامت یا یوم حساب میں ہر ایک بیہودہ بات ہر ایک چھوٹے سے چھوٹے گناہ کا بھی حساب دیا جائے گا کیونکہ ہر انسان اپنے ہی اعمال یا اپنی ہی باتوں سے نیک اور گنہگار ٹھہرتا ہے اگر کفارہ درست اور صحیح ہے تو یوم قیامت میں کسی باز پرس اور کسی حساب کتاب کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ سب حساب اور مطالبہ اعمال نامہ حضرت مسیح علیہ السلام میں لکھا جا چکا ہے اور کفارہ ماننے والے بریت پا چکے ہیں اور اگر حساب نہیں لیا جاوے گا تو حضرت مسیح علیہ السلام کی یہ وعید یا یہ قول باطل جاتا ہے کیونکہ حضرت ممدوح تاکیدی رنگ میں فرماتے ہیں کہ چھوٹی سے چھوٹی بُری بات کی بھی باز پرس ہو گی چاہے کفارہ ہو یا نہ ہو یہ ایک ایسی مشکل ہے جو کفارہ سے بھی حل نہیں ہو سکتی یاوہ مانو یا وہ۔ دوسرے فقرہ میں فرماتے ہیں آخر ماتے کیا یہ فیصلہ ہی فرما دیا ہے کہ ہر انسان صرف اپنی ہی باتوں اور اپنے ہی اعمال کی وجہ سے راستباز سمجھا جائیگا اور اپنی ہی باتوں سے گنہگار بھی ٹھہریگا اس صورت میں کفارہ یا کفارہ کی ضرورت بالکل اڑ جاتی ہے اور مطلع صاف ہو جاتا ہے جس ذاتِ اقدس سے کفارہ نکلا وہی ان کلمات عظیمہ سے اُسکی تردید کرتی ہے

اگر یہ کہا جائے کہ کفارہ کی صورت میں بھی ایک گنہ گار گنہگار رہتا ہے لیکن بوجہ اقرار کفارہ اسکی بخشش ہو جاتی ہے تو درست نہیں ہوگا کیونکہ حضرت مسیح علیہ السلام انہی آیات میں فرماتے ہیں کہ اپنی ہی باتوں کی وجہ سے انسان راست گار یا راستباز بھی ٹھہرتا ہے جب اپنی ہی باتوں سے انسان نیک ہو سکتا ہے تو پھر اُسپر مواخذہ کیا ہوگا اور کفارہ کی ضرورت کیا رہے گی۔

(ہرکہ را کہ حساب پاک از محاسب، چہ پاک)

لفظ اپنی ہی پر بہت زور دیا گیا یا زور ڈالا جا سکتا ہے صرف اپنی ہی کرتوتوں کی وجہ سے انسان مبتلائے عذاب ہوگا اور اپنی ہی نیکیوں اور عمدہ باتوں کی وجہ سے نجات پائیگا یہ تائیدی فقرہ مؤید عمل ہو کر کفارہ کی رسّیاں توڑ ہی نہیں دیتا بلکہ اُسکی ہستی بھی مٹا دیتا ہے غور کرنیوالے غور کریں اور سوچنے والے سوچیں کہ ان آیات سے کیا کچھ نکلتا ہے شاید کہ اُن کے واسطے کوئی اور سیدھی راہ نکل آئے۔

در بیاباں فنا شدن آخر تا چند
رہ بہ پرسیم مگر بہ مہمات بریم

(۱۶) باب ۱۳۔ درس ۴۳ و ۴۹۔ مضمون۔ تب راستباز اپنے باپ کی بادشاہت میں آفتاب کی مانند نورانی ہوں گے۔ اس جہان کے آخر میں ایسا ہوگا کہ فرشتے آویں گے اور راستبازوں میں سے شریروں کو الگ کریں گے۔

تنقید۔ باب ۱۳ میں حضور علیہ السلام نے بہت اچھی تعلیم دی ہے نجات پانے کے واسطے نہایت ہی کمالیت سے تمثیلات دی ہیں ان آیتوں میں یہ کہا ہے کہ جو راستباز ہیں وہ خدا کی بادشاہت میں نورانی ہوں گے راستبازی کی بابت حضرت موصوف کے طرز کلام سے اعمال ہی کی نیکی پائی جاتی ہے نہ کہ اقرار کفارہ۔ ۴۹ آیت میں کہا گیا ہے کہ اخیر پر فرشتے راستبازوں کو شریروں سے الگ کریں گے گویا اعتراف کفارہ بالائے طاق رہ جائے گا اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ جو لوگ معترف کفارہ نہیں ہیں انکو کفارہ ماننے والوں سے الگ کر دیا جائے گا تو یہ نہیں ہو سکتا کہ کفارہ ماننے والوں میں بھی گناہ ہوتے اور بدیاں پائی جاتی ہیں اگر انکو بھی جماعت شریروں ہی میں رکھا گیا تو پھر

کفارہ کی خیر نہیں اور اگر اُن سے بوجہ اقرار کفارہ درگ
پیشین گوئی کالعدم ہو جاتی ہے اور یہ وعید کسی
(۱۷) باب ۱۶ - درس ۲۷ - مضمون - کیونکہ ا
فرشتوں کے ساتھ آویگا تب ہر ایک کو اُسکے اعما
تنقید - اس آیت میں بھی اعمال ہی کے موافق
آخری دنوں میں حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں آ
اُنکے حضور میں پیش ہونگے: کہ صرف اعتراف کف
تو یہ کل سیدھی نہیں رہتی۔ کفارہ عمل نہیں ہے بد
میں عمل کی بات کونسی ہے کفارہ میں صرف یہ ہوتا
بے گناہ معصوم نبی کے کندھوں پر رکھ دیا جاتا ہے
رکھنا وغیرہ وغیرہ عمل ہیں اور خدا کو ایک جاننا ایک
دراصل مستغنی کرتا ہے کیونکہ اگر ایک شخص عیسا
عبادت نہیں کرتا روز کی دعا نہیں مانگتا تو ملزم نہیں
کا انکاری نہیں ہے لیکن اگر ایسے شخص پر دعا اور عباد
ٹوٹ نہیں جاتا تو اسکی چولیں ڈھیلی ضرور ہو جاتی ہیں
ایک عیسائی مقر کفارہ پر عبادت لازمی ہے یا نہیں
وہ مورد الزام ٹھہرتا ہے یا نہیں اگر ٹھہرتا ہے تو کفارہ کی
ٹھہرتا تو ان آیتوں میں جس طریق سے آخری دنوں میں را
کیا جائیگا وہ خدشہ سے خالی نہیں۔

(۱۸) باب ۱۸ - درس ۱ تا ۳ - مضمون - اس وقت شاگر
اُس سے پوچھا کہ آسمان کی بادشاہت میں سب سے بڑا کون ہے یسو
بلا کے اُسے اُن کے بیچ میں کھڑا کیا اور کہا میں تم سے سچ کہتا ہوں
چھوٹے لڑکوں کی مانند نہ ہو تو آسمان کی بادشاہت میں ہرگز داخ

منوں میں تھا کہ آسمان کی بادشاہت میں یا خدا کے نزدیک
ے انسان کا مفہوم مذہبی رنگ میں سوائے
ے الفاظ میں اس کا یہ مطلب تھا کہ کس طرح پر انسان
امتیاز روحانی پا سکتا ہے حضرت مسیح علیہ السلام نے
تمک اس کی مانند خود کو نہ بناؤ تب تک تم خدا کی
ے اور یہ بھی اس شرط سے کہ توبہ کرو ایک چھوٹا
اسطے کہ چھوٹے لڑکے عموماً بے گناہ اور معصوم
یہ، بھی عام طور پر کہا جاتا ہے یہ ایک معصوم بال اور
بالکل چھوٹے لڑکوں کے مجرمانہ افعال کو تعذیب اور
طے سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔
صوم اور پاک باز بناؤ۔
تے ہیں۔
ضرت مسیح علیہ السلام انکو وعظ میں نمونہ صادق کے
ن ثابت ہوا کہ انسان پشتی گنہگار نہیں ہے کیونکہ
ے چھوٹے لڑکے یا انسان کے لڑکے کا پیش نہ کرتے
ٹے لڑکوں کی مانند ہو اگر یہ کہا جائے کہ یہ صرف بطور
، کا جو شمار لیا جاتا ہے وہ درست نہیں ہے تو کہا جائیگا
نہ پیش کر ما اس بحث میں کہ کس طرح کوئی انسان خدا کی
ہے کیسے بے معنے اور بے محل ہو سکتا ہے اور اگر یہ
یل سے یہ مراد تھی کہ ایسے سادہ ہو کر کفارہ پر یقین لاؤ تو
سوال شاگردوں نے کیا تھا اس کا یہ جواب نہیں ہو سکتا اور
ٹکے کو بطور ایک پاکیزہ نمونہ کے پیش کیا گیا ہے اور یہ عملی رنگ
کے رنگ میں اور ساتھ ہی لڑکے توبہ کی بھی شرط ہے جو عقیدہ

کفارہ کے صراحتاً و بداہتاً خلاف ہے۔

(۱۹) باب ۱۸۔ ورس ۸ تا ۹۔ مضمون

کھلا دے اُسے کاٹ ڈال اور اپنے پاس سے پھ
میں داخل ہونا تیرے لیئے اس سے بہتر ہے
کی آگ میں ڈالا جائے اور اگر تیری آنکھ تجھے
پھینکدے کیونکہ کانا ہو کر زندگی میں ہونا تیر
آنکھ ہوں اور تو جہنم کی آگ میں ڈالا جا

تنقید۔ یہ وعظ ایک بڑا بسیط اور پُر
نہیں کھلتی ہیں ذرا تامل اور تحقیق سے پڑھنے
کھل سکتے ہیں خلاصہ اس وعظ کا یہ ہے کہ جو ع
ہے کر وہ ترک کر دیجائے مثلاً ایک انسان کے دل
ہوں تو لازم ہے کہ اُنہیں چھوڑ دیا جائے اگر حر
ہے اگر غفلت روکتی ہے تو چھوڑ دی جائے اگ
لے جائیگا اور اُسی کی وجہ سے باب نجات بند
پڑتی ہے اور کفارہ کی راہیں بند ہوتی ہیں کیونکہ
گو آنکھ اور کان کے پیرایہ میں تمثیل دی گئی ہے
یہی مراد تھی تو پھر لازم آتا ہے کہ جب کوئی عضو
حضرت مسیح علیہ السلام کاٹ ہی دیا جائے حا
کرتے رہزن ڈاکے مارتے اور بدبین بُری نگا
اور بد کہتے ہیں نہ تو اُنکی آنکھیں۔ کان۔ (
اُنہیں جسم سے دُور کیا جاتا ہے اگر
بھی لازمی ہے اور اُس صورت م
کیونکہ باوجود تسلیم کفارہ کے بھی

رہبی رنگ میں ان سزاؤں کا بیان کیا ہے نہ کہ سیاسی
سیاسی قانون دان کے پیرایہ میں اگر اخلاقی رنگ
ہی جواب ہوگا جو برنگ سیاسی دیا گیا ہے دونوں
رہیں گی اور گناہ ہر حالت میں بغیر رنگ لائے اور
بیت اور عدل و انصاف بھی معرض بحث میں

رنیوالی قوم

ی ہفتہ وار اخبار ہے اور لاہور سے شائع ہوتا ہے اس کے
ے آرٹیکل ہے جس کا عنوان ہے ایک مرنیوالی قوم۔
وہ اس وجہ سے اسکو ایک مرنیوالی قوم قرار دیتا ہے۔
ے کہ ہندوؤں کی تعداد میں بجائے اسکے کہ ترقی ہو یا کم از کم
۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ سنہ ۱۸۸۱ء کی مردم شماری میں ہزار
ے اور باقی دوسرے مذاہب کے پیرو۔ سنہ ۱۹۱۱ء کی مردم شماری
ہے کہ اب دس ہزار میں چھ ہزار نو سو انتیس ہندو رہ گئے ہیں
ں کے مختلف صوبجات میں ہندوؤں کی آبادی کس قدر

سنہ ۱۹۰۱ء	سنہ ۱۹۱۱ء
۴۴ فیصدی	۴۴ فیصدی
۸۰ فیصدی	۸۲ فیصدی
صدی	۸۸ فیصدی
ی	۳۲ فیصدی
ا	۸۵ فیصدی
	۷۵ فیصدی
	۸۲ فیصدی
	۶۶ فیصدی